سدرۃ المنتہیٰ

انسانی زندگی کا کوئی ایک سیاہ دن ہوتا ہے جو اس کی پوری زندگی میں سیاہیاں بھر دیتا ہے۔
اس کی زندگی کا وہ سیاہ دن کون سا تھا جسے زندگی کے کیلنڈر سے خارج کر کے وہ تمام سیاہیوں کو پالش کر کے روشنی میں تبدیل کر سکتی تھی۔ اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا، جو اس کے پاس نہیں تھا۔
اور حل کرنے کے لیے بھی وقت چاہیے تھا جو گزر

ناولٹ

چکا تھا اور اس وقت اسے ہر جگہ دھندلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شدید تھکن کے باعث اس کے اندر کا اشتعال کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ صبح ساڑھے پانچ کے درمیان اسے نیند آ گئی تھی آنکھ کھلی تو ساڑھے دس بج چکے تھے اور اس کی آنکھیں ایک دفعہ پھر بند ہونے کو تھیں مگر وہ پھرتی سے اٹھی، کپڑے نکالے اور نہا کر آنے کے بعد اسے لگا کہ کچھ تھکن ہلکی ہوئی ہے۔ اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں، بیگ لیا، گیلے بال سلجھائے بغیر کیچر میں جکڑے اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی۔ وہ عین سامنے بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے جن میں فہد بھی تھا۔

"ثانیہ! اٹھ گئی میری بچی۔ آ جاؤ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ آؤ ناشتہ کر لو بیٹا۔" وہ اسے فریش محسوس کر کے چہکی تھیں۔

"مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔ کون سے ہسپتال میں بھیجا ہے اسے ابو! ایڈریس چاہیے۔"

"تم بیٹھو بچے! ناشتہ تو کر لو پہلے۔" ابو اس کے چہرے پر چھائی بے چینی سے گھبرائے تھے۔

"پلیز بتا دیں۔ کون سے پاگل خانے میں ڈالا ہے اسے۔ کس کے حوالے کر آئے ہیں بتائیں مجھے، جانا ہے ابھی۔"

"ثانیہ! بیٹھ کر ناشتہ کر لو پھر بات کرتے ہیں بیٹا۔"

"ابو! وہ یتیم اور لاوارث ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے جہاں چاہے پھینک دیا جائے۔ انسان ہے وہ، مجھے اگر کوئی اس طرح پاگل خانے میں ڈال دے تو آپ کو کیسا لگے گا؟"

"ثانیہ! آرام سے بیٹھو' جوس پی لو پھر بات کرتے ہیں۔ تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔" امی کو اب غصہ آ رہا تھا۔ اسے بٹھاتے ہوئے بولیں۔

"ہوش میں نہیں ہوں تو مجھے بھی ڈال دیں اس کے ساتھ پاگل خانے میں' یہی حل ہوتا ہے نا آپ لوگوں کے پاس۔" وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے چیخی تھی۔

"ہم نے جو بھی کیا تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے بیٹا! اس کا وہاں علاج ہو گا۔ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بیٹھ جاؤ شاباش' کچھ کھا لو پھر چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور سمجھانے لگے۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا ابو! آپ پلیز چلیں ابھی اسی وقت پلیز۔" عجیب بے بسی اور لاچاری تھی اس کے چہرے پر۔

"اچھا چلو' چلتے ہیں۔" وہ اس کا سر تھپک کر بولے۔

"احسان! اسے بٹھائیں ناشتہ کروائیں آپ اسے پاگل خانے لے جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر یہ اور پاگل ہو جائے گی۔" وہ غصے سے اٹھی تھیں۔

"میں بھی وہیں رہوں گی۔ اب سن لیں۔"

"ثانیہ ریلیکس بیٹا' اچھا چلو چلتے ہیں۔" وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے باہر نکلے تھے۔

"ہم اسے اپنے گھر لے آئیں گے ابو۔"

"او کے دیکھتے ہیں کول ڈاؤن۔" وہ چابی اس سے لیتے ہوئے آگے بڑھے۔

"یہ بھی پاگل ہو گئے ہیں۔ پہلے بیٹی کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اسے پاگل کر کے چھوڑیں گے۔" وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

"میرا خیال ہے میرے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے بلا کر ایک اور غلطی کر لی ہے۔"

اس نے دیکھا تھا کہ اتنی دیر میں ثانیہ نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف دیکھا تھا' نہ بات کی تھی۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا' اس کا رویہ اسے تکلیف دے رہا تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ثانیہ ہے' جسے وہ کچھ سال پہلے چھوڑ گیا تھا۔ وہ بظاہر ویسی ہی تھی مگر اندر سے پوری کی پوری بدل چکی تھی۔ مگر وہ کہاں جانتا تھا کہ اس بدلنے میں اسے کتنی اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اگر بدلی تھی تو کیوں بدلی تھی۔

"یہ وہ ثانیہ نہیں ہے۔ ثانیہ بدل چکی ہے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر افسوس اور جتانے والے انداز میں کہا تھا۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی..... وہ شادی کے بعد بھی تمہیں یاد کرتی رہی' تمہارا انتظار کرتی رہی۔ کاش تم تب لوٹ آتے۔ مگر اب بھی سب کچھ پہلے جیسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کوشش کرو۔ اگر تم چاہو تو تم اسے پھر بدل سکتے ہو فہد! تم لوگ ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔ وہ ابھی شدید دباؤ میں ہے' اسے وقت دو پلیز۔"

"وہ اپنے پاگل شوہر کے لیے رو رہی ہے' شور مچا رہی ہے' اسے واپس لانے کی بات کر رہی ہے اور آپ کہتی ہیں' وہ میرے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گی۔"

"تم نے دیکھا نہیں' اس نے انگلی میں اب تک تمہارے نام کی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے' تم نہیں جانتے' میں جانتی ہوں اس نے تمہارا کتنا انتظار کیا..... اب وہ خفا تو ہو گی ہی۔ تم اسے وقت دو۔ پرانی باتیں یاد دلاؤ اسے۔ وہ مدثر سے ملے گی تو اس کے پاگل ہونے کا یقین آ جائے گا اسے۔ اس کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"

"بہت مشکل ہے یہ سب۔" اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا تھا۔

"مگر ناممکن نہیں ہے۔" وہ اسے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیا ہو گا آنٹی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"وہی ہو گا جو ہم چاہتے ہیں..... ہم اس سے طلاق کے پیپرز سائن کروا لیں بس پھر کچھ ہی مہینوں بعد تم شادی کر کے ثانیہ کو اپنے ساتھ لے جانا۔"

"کہنا بہت آسان ہے۔ مگر بعض اوقات سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔"

"تم ثانیہ سے محبت نہیں کرتے فہد! کیا اسے اپنانا نہیں چاہتے؟"

"کرتا ہوں تب ہی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا ہوں۔"

"تو پھر انتظار کرو اور اس مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دو۔ جیسے ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔"

"میں اس کے ساتھ ہوں۔ مگر کاش وہ بھی یہ سمجھ پائے۔"

"سمجھ جائے گی فہد! سب سمجھ جائے گی بس تم عقل سے کام لو۔"

"محبت اور عقل کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ اگر عقل سے کام لیتا تو یہاں اس وقت آپ کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا۔" اس کی بے رخی کے شکوے کرتا وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

"یہ تو بہرحال سچ ہے۔" وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی تھیں اور پھر دونوں ذہن اپنے اپنے منصوبے اپنے طریقے سے ترتیب دے رہے تھے اور ڈائننگ ٹیبل کے اطراف مکمل خاموشی تھی۔ گہری سوچوں والی خاموشی۔

✡ ✡ ✡

مینٹل اسپتال وارڈ تھری میں دور ایک بیڈ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا وہ مدثر احمد تھا' جسے لوگ ہمیشہ سے پاگل کہتے تھے۔ جسے وہ بھی ہمیشہ پاگل کہتی تھی' جسے ڈاکٹر بھی پاگل کہتے تھے اور پھر اس کے گھر والوں نے اس پاگل کو پاگل خانے پہنچا کر ہی دم لیا تھا..... وہ لاکھوں بیگانے چہروں میں ایک اسی اپنے چہرے کو دیکھنے کے لیے لوہے کی گرل کے پاس رکی ہوئی تھی۔

"آپ نے اسے اتنے لوگوں کے بیچ رکھا ہوا ہے۔ یہ سارے مل کر اسے مزید پاگل کر دیں گے ڈاکٹر صاحب!"

احسان صاحب کچھ فاصلے پر کھڑے ڈاکٹر سے بات

www.paksociety.com

کر رہے تھے۔ جب وہ لوہے کی گرل سے ہٹ کر ان تک آئی۔

"ان کو اکیلا رکھنا ان کے لیے مزید خطرے کا باعث ہے محترمہ!"

"میں اس کو یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ اسے باہر نکالیں یہاں سے۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا لوہے کی گرل توڑ کر اسے باہر لے آئے۔

"فی الحال یہ بہت مشکل ہے محترمہ! انہیں علاج کی ضرورت ہے۔"

"یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا..... میں اسے کب لے جا سکوں گی۔"

"دیکھیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔"

"میں جانا چاہتی ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"محترمہ! پھر تو آپ ان کی دشمن ہو ئیں کہ اس حالت میں آپ انہیں گھر لے جائیں گی۔ یہ ٹھیک تو نہیں ہوں گے البتہ آپ کا اور اپنا نقصان ضرور کر بیٹھیں گے۔"

"یہ یہاں اور پاگل ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب! کیسے رہ پائے گا یہ یہاں۔"

"دیکھیں محترمہ! پاگل خانے لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لیے ہوتے ہیں نا کہ مزید پاگل کرنے کے لیے۔"

"اگر ایسا ہوتا تو یہ کھچا کھچ بھرے نہ ہوتے۔ مجھے بتائیں کتنے لوگ ہیں یہاں سے جو ٹھیک ہو کر گھر گئے ہوں گے۔"

"ثانیہ بیٹا! فضول بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ لوگ علاج کریں گے اس کا، ان کو اپنا کام کرنے دو پلیز۔" وہ بہت دیر سے چپ تھے۔ مگر اب لگ رہا تھا اسے سمجھا کر چپ کرانا ضروری تھا۔

"آپ کو ٹرسٹ کرنا چاہیے محترمہ! یہاں سے بہت لوگ صحت یاب ہو کر جاتے ہیں، قصور آپ لوگوں کا ہے جو ہمیشہ تب مریض کو لاتے ہیں جب وہ سارے حواس کھو چکا ہوتا ہے۔ اب کچھ وقت تو لگے گا ہی کیا ڈاکٹرز نے نہیں کہا تھا کہ انہیں مینٹل اسپتال پہنچائیں۔ مگر آپ لوگ انہیں اب لائے ہیں جبکہ علاج بہت مشکل ہو چکا ہے ان کا اور اس حالت میں کہہ رہی ہیں کہ انہیں آپ لے جائیں گی۔ اور ہم کیا دشمن ہیں جو ان کا علاج نہیں کریں گے اور یہ مزید پاگل ہو جائیں گے۔ کمال کرتی ہیں آپ۔"

"ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہے ہیں ثانیہ! اس کا علاج ہونے دو۔"

"مجھے اس سے ملنا ہے ابھی۔"

"ابھی نہیں مل سکتیں۔ ابھی ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

"مجھے اس سے ملنا ہے ابھی..... مجھے ملوائیں میں کچھ نہیں جانتی۔"

"مجھے تو آپ بھی سائیکو لگ رہی ہیں معاف کیجیے آپ اس طرح بات کر رہی ہیں مجھ سے جیسے میں نے لاک اپ میں ڈالا ہے آپ کے شوہر کو؟"

"لاک اپ میں ہی تو ڈالا ہوا ہے آپ نے..... دیکھیں کیسے پڑا ہے یتیموں کی طرح۔"

"یہاں بہت سارے لوگ ہیں اکیلے یہ نہیں ہیں مس۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ اسے ایک بار ملوا دیں پلیز۔"

"احسان صاحب! آپ تو اچھے خاصے سمجھ دار آدمی ہیں۔"

"جی ڈاکٹر صاحب! مگر آپ اس کی حالت دیکھیں۔ اسے ایک بار ملنے دیں۔ اسے یقین نہیں آتا ہم میں سے کسی پر بھی۔ یہ سمجھتی ہے ہم نے غلط کیا ہے اسے یہاں لا کر۔ آپ اسے دکھا دیں اس کی جو حالت ہے۔"

"میں نے دیکھی ہوئی ہے ساری حالت پھر بھی میں کہوں گی کہ آپ لوگوں نے ظلم کیا ہے اسے یہاں لا کر۔"

"احسان صاحب مجھے تو یہ بھی بہت ڈسٹرب لگ رہی ہیں۔ چلیں بہرحال میں آپ کی ضد پر ملوا دیتا ہوں ..... مگر۔" ڈاکٹر اس کی ضد کے آگے بے بس ہو کر اسے لے آیا۔ دروازے کے پاس تالا کھولنے لگا۔ اس سے پہلے اس نے اسٹاف میں سے ایک دو آدمیوں کو

آواز دے کر بلایا تھا اپنے ساتھ اندر لے جانے کے لیے۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک پاگل ان کی طرف جھپٹا تھا، جسے ایک آدمی نے قابو کر لیا۔ ایک شخص ان کو دیکھ کر ..... قہقہے لگانے لگا اور کچھ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے تھے۔

وہ ڈرے ڈرے انداز میں مدثر کے پاس اسے لے آئے جہاں وہ دنیا جہان سے اجنبی بنا گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ اس کی قمیص کا کالر اکھڑا ہوا تھا اور آستین کے کف پھٹے ہوئے تھے۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے پر کھرونچوں کے کچھ نشان تھے۔

"مدثر..... یہ کیا ہوا ہے چہرے پر۔ کس نے زخمی کیا ہے۔" وہ بے ساختہ بڑھی تھی اس کی طرف۔

"میڈم! ذرا فاصلے پر۔" آدمی نے اسے خبردار کیا۔

"مدثر مجھ سے بات کرو۔" وہ ارد گرد حواس باختہ انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کچھ نہیں سن رہا۔

"مدثر! میری طرف دیکھو۔ مجھ سے بات کرو۔" اس نے بازو ہلایا اس کا۔

"مت مارو مجھے، چھوڑ دو۔" وہ چیخا تھا بازو چھڑا کر۔

"مدثر! میں ثانیہ ہوں۔ میری طرف دیکھو۔"

"پھر میں تمہیں بہت ماروں گا۔ میرے کھلونے چرا لیتے ہو۔ مجھے مارتے ہو۔ کھڑکی سے گرا دوں گا تمہیں۔" وہ بچوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے۔ یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے ابو!" وہ بے بسی سے کہنے لگی۔

"بیٹا! اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ یہ اس وقت بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے گھر کی چیزیں توڑ دی تھیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"مدثر! مجھ سے بات کرو اور میری بات سنو! میں ثانیہ ہوں تم سے ملنے آئی ہوں۔ گھر چلو گے تم بتاؤ۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اجنبی سے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"میں ثانیہ ہوں مودی ..... تمہیں لینے آئی ہوں۔"

"مجھے درد ہوتا ہے..... سب مارتے ہیں..... ڈیڈی نے مارا۔ میں تو ڈاکٹر بنوں گا..... بہت بڑا ڈاکٹر۔" وہ بہت دنوں بعد بولا تھا۔

"اچھا۔ پھر تم گھر چلو گے....." اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"پہلے میں تمہیں ماروں گا۔ تم نے میری فٹ بال کھڑکی سے نیچے پھینک دی تھی نا۔" اس نے ثانیہ کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

"ارے روکیے اسے ڈاکٹر صاحب! اٹھو ثانی۔" انہوں نے فوراً اسے اپنی طرف کھینچا۔ جب تک آدمی اور ڈاکٹر نے اسے تھام لیا۔

"یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" وہ ان سے لگ کر بچوں کی طرح رو دی تھی۔

"مس ثانیہ! باہر چلیں پلیز۔"

"یہ اپنے بال کیوں نوچ رہا ہے کیوں مار رہا ہے یہ خود کو" وہ اب اپنے بال نوچتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ اس نے خود اپنے ناخنوں سے اپنا چہرہ کھرچا ہوا تھا۔

"چلو شاباش باہر چلو بیٹا۔" وہ اسے باہر لے آئے اور دروازہ فوراً بند کر دیا گیا۔ وہ ابھی تک چیخ رہا تھا اور کچھ آدمی اس کے ساتھ چیخنے لگے تو کچھ بے ہنگم قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ وہ بے بسی سے لوہے کی گرل کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔

"ریلیکس ثانیہ! بیٹا گھر چلو۔"

"انہیں رو لینے دیں احسان صاحب! اس کے بعد نیند کی گولی کھلا کر سلا دیجیے گا۔ بہتر محسوس کریں گی۔" ڈاکٹر کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی روتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ جب سے گھر آئی تھی، چپ چپ بیٹھی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا نہ ناشتہ کیا تھا۔ ابھی بھی انہوں نے اسے زبردستی چند لقمے کھلائے تھے۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کی اپنی کیفیت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ نیند کی گولی لینے کے باوجود وہ سو نہ سکی اور

اب اس کا دماغ شائیں شائیں کررہا تھا۔

"ثانیہ اب ٹھیک ہے انکل۔" وہ پورے دن میں اب آیا تھا اس کے پاس۔

"وہ بہت اپ سیٹ ہے فہد۔۔۔۔ بات نہیں کررہی ہے۔ بمشکل چند لقمے لیے ہیں۔ تم جاؤ کوشش کرو اس سے بات کرنے کی۔ اگر تم سے وہ کچھ بات کرلے گی تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔"

"جی میں کوشش کرتا ہوں۔۔۔۔ آپ فکر نہ کریں انکل۔"

"اوکے بیٹا۔۔۔۔ شکریہ تم ہی اسے سنبھال سکتے ہو ابھی۔"

"جی میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ ان کے جانے کے بعد اندر آیا۔

"کیا حال ہیں میڈم! کیا ہورہا ہے؟" وہ کشن لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ بہت تھکے ہوئے انداز میں بال باندھنے لگی۔

"تمہیں یاد ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے تمہاری نیند اڑجاتی تھی۔"

"اتنی پرانی باتیں مجھے یاد نہیں رہتیں!" اس کا لہجہ خالی سا تھا۔

"ثانی تم مجھ سے خفا ہو؟"

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں سونا چاہتی ہوں۔" وہ فوراً" اٹھی۔

"مجھے پتا ہے تم پریشان ہو مگر دیکھو پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم مل کر کوئی حل نکال لیتے ہیں۔"

"کیا حل ہے تمہارے پاس میرے مسائل کا۔ بولو؟" وہ تھکے تھکے انداز میں پھر بیٹھ گئی۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔۔۔۔ میں لوٹ آیا ہوں۔ ہم اس سے پیپرز سائن کروالیں گے۔ اس کے بعد ہم شادی کرکے یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اپنی نئی زندگی شروع کریں گے اور خوش رہیں گے۔ سب بھول جاؤ تم۔"

"تم اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہو؟"

"چھوڑ دوں گا تمہارے لیے۔"

"مگر میں اپنے شوہر کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ بھی اس حالت میں۔"

"تم پاگل ہو گیا؟ ایک پاگل کے ساتھ کیسے زندگی گزارو گی تم۔"

"پاگل ہوں تب ہی ایک پاگل کے ساتھ رہنے کی خواہش ہے۔ میرے پاس کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہیں بچا۔ کسی کے لیے بھی۔ میں بس ایک بے سہارا آدمی کو مزید بے سہارا نہیں کرسکتی۔"

"تم اپنی پوری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتیں ثانیہ۔"

"میری زندگی داؤ پر لگ چکی ہے آج سے ڈھائی سال پہلے۔ اس وقت کہاں تھے تم۔۔۔۔؟"

"ثانی! میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا میری کیا مجبوری تھی۔ سب ٹھیک ہوسکتا ہے۔ دیکھو ہم دونوں کو قدرت نے ایک موقع دیا ہے پھر سے ملنے کا۔ ہم ایک نئی لائف شروع کریں گے۔ بھول جاؤ سب۔ ہمارے سارے خواب پورے ہوں گے۔"

"اس ڈھائی سال کے مشکل ترین سفر نے میری آنکھوں سے سارے خواب نوچ لیے ہیں فہد! اب میرے پاس کسی خواب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایک تپتے ہوئے صحرا میں تنہا کھڑی ہوں جسے اکیلے پار کرنا میرا مقدر ہے۔"

"زندگی بہت مشکل ہے ثانی اور بہت لمبی بھی۔ اسے اکیلے گزارنا آسان نہیں۔ ہم مل کر سب کچھ ٹھیک کرلیں گے۔"

"میں نے کہا نا کہ خواب دیکھنے کی عمر گزر گئی۔ تم چلے جاؤ واپس۔"

"ثانی۔۔۔۔ اچھا بتاؤ کیا کرو گی اگر میں واپس چلا جاؤں تو؟"

"وہی جو میرا نصیب ہے۔ انتظار۔"

"اور اگر وہ پاگل ٹھیک نہیں ہوا تو؟"

"اسے پاگل مت کہو۔" اسے بہت برا لگا۔

"پوری دنیا کہتی ہے۔ کس کس کو روکو گی۔ وہ پاگل

خانے میں پڑا ہے اور تم کہتی ہو اسے پاگل مت کہو۔"

"ٹھیک ہے وہ پاگل ہے مان لیا تو ــــ ہے تو میری زندگی کا حصہ 'میری ذمہ داری۔"

"کچھ نہیں ملے گا تمہیں یہ سب کرکے۔ وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس کی میموری ختم ہو چکی ہے' اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔ وہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہونے والا ثانیہ!"

"تب بھی یہ میرا نصیب ہے۔"

"ثانی! بے وقوفی مت کرو ــــ تمہاری زندگی ضائع ہونے کے لیے نہیں ہے۔"

"میری زندگی ضائع ہو چکی ہے ــــ تم کیا سمجھتے ہو۔ آسان ہوتا ہے یہ سب۔ میرے لیے اس سے شادی کرنا جتنا مشکل تھا اتنا ہی مشکل اسے چھوڑنا ہے۔ ایک انسان جو میرے آسرے پر پڑا ہے۔ اسے میں بے یارومددگار چھوڑ کر دوسری شادی کرلوں گی ــــ یہ کہنے میں آسان لگتا ہے مگر کرنے میں بہت مشکل ہے۔"

"مگر نا ممکن نہیں ہے ثانی!"

"مر چکی ہوں میں۔ بار بار مت مارو مجھے ــــ چلے جاؤ فہد ــــ اپنا وقت برباد مت کرو۔ میں جس حال میں بھی ہوں یہ میرا نصیب ہے۔"

"میں تمہیں ایک پاگل کے حوالے کردوں' جس کے ساتھ رہ کر تم بھی پاگل ہو جاؤ۔ میں نے تمہیں کھویا ضرور تھا ایک بار مگر اب نہیں۔"

"زندگی مذاق نہیں۔ نہ ہی بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی تاریخ ہے' جسے ڈسٹر اٹھا کر صاف کرلیا جائے۔" ایک لمحے کے توقف سے دوبارہ بولی۔

"میں بہت تھک چکی ہوں ــــ مجھے سونا ہے تاکہ میں کچھ نارمل ہو سکوں۔"

"میں یہیں ہوں۔ تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔"

"میرا فیصلہ کل بھی یہی ہوگا۔"

"میں پھر بھی انتظار کروں گا۔"

"تم اپنا وقت برباد کرو گے۔"

"ثانی!" وہ دکھ سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"لائٹ بند کر دینا پلیز جاتے ہوئے۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"کیا سب اتنی آسانی سے ختم ہو سکتا ہے۔"

"آسانی سے ختم ہو چکا ہے ــــ آج نہیں تین سال پہلے۔"

"میں تلافی کرنے آیا ہوں ثانی۔"

"تم وقت ضائع کرنے آئے ہو۔" اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"تم میرے جانے کے بعد پچھتاؤ گی۔ ایسا نہ ہو کہ پھر مجھے آواز دو۔"

"آواز دے کر دیکھ چکی ہوں' دوبارہ قطعی ایسا نہیں کروں گی۔"

"تم اپنی زندگی مشکل کر رہی ہو ثانیہ!" وہ اب بھی دروازے کے پاس رکا تھا۔

"میں پچھلے ڈھائی سال سے اس مشکل سے گزر رہی ہوں۔ اب عادت ہو چکی ہے۔"

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم بھی پاگل ہو گئی ہو اس نفسیاتی کے ساتھ رہ رہ کر۔"

"شکر ہے تم نے اب کی بار اسے پاگل نہیں کہا۔"

"ایک ہی بات ہے۔ مگر تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بات ہوگی۔"

"میرے پاس اتنا اسٹیمنا نہیں ہے کہ ایک محبت کو بار بار دہراؤں۔"

"ثانی! میری کوئی حیثیت نہیں ہے تمہارے نزدیک۔ جو تمہارے لیے وہاں سے چل کر آیا ہے۔ اتنی دور سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ بکواس کر رہا ہوں' اتنی دیر سے میں کیا۔ پتھروں سے سر پھوڑ رہا ہوں۔" اسے آخر کار غصہ آگیا۔

"بکواس کر رہے ہو اور پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔ مرو اس کے ساتھ پاگل خانے میں۔"

"شکریہ' بتی بند کرکے جانا پلیز۔" اس کے چہرے پر تھکی ہوئی عجیب مسکراہٹ تھی۔

"معاف نہیں کروں گا تمہیں میں۔ سن لو۔ خوش نہیں رہ پاؤ گی کبھی۔"

"میں نے بھی تمہیں معاف نہیں کیا تھا۔ تم اگر خوش نہیں رہ پائے تو۔"

"ٹھیک ہے ــــ خوشی سے برباد کرو اپنی زندگی تم' اسی ضد میں رہو۔"

"بہت بار کہہ چکی ہوں بتی بند کر دینا اور دروازہ بند۔" اس نے کہتے ہوئے ٹانگیں سیدھی کرلیں اس نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔

ادھر گھپ اندھیرے میں دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور چہرہ بھگو گئے۔

☼ ☼ ☼

"تم جا رہے ہو فہد!" وہ پیکنگ کر رہا تھا' جب وہ اندر آئیں اس کے کمرے میں۔

"جی ہاں! میں نے سوچا مزید وقت برباد کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔"

"تم اسے اس حال میں چھوڑ کر جاؤ گے فہد! جب اسے تمہاری شدید ضرورت ہے۔"

"اسے کوئی میری ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب بہلاوے ہیں۔ میں مزید یہاں رک کر تماشا نہیں بن سکتا۔"

"اور وہ جو تماشا بن گئی ہے۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں۔"

"وہ خود بنی ہے اس میں کس کا قصور ہے بھلا۔"

"تمہارا فہد! تمہارا قصور ہے اس میں۔ تم اگر اسے چھوڑ کر نہ جاتے تو وہ یہ فیصلہ کبھی نہ کرتی۔"

"تو اسے پورا جہاں چھوڑ کر اس پاگل سے ہی شادی کرنی تھی؟"

"یہ شادی اس کے باپ کی پسند سے ہوئی تھی۔ تمہیں پتا تو ہے اس نے بس سمجھوتا کرلیا تھا کیوں کہ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔"

"جو بھی ہے' پر اب میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ آیا تھا اور وہ نہیں مان رہی تو میں کیا کر سکتا ہوں بھلا۔" وہ بیگ کی زپ بند کرکے سوٹ کیس نیچے اتار کر ان کی طرف مڑا۔

"وہ تم سے محبت کرتی تھی فہد! اسے مت چھوڑو۔"

"کرتی تھی مگر کرتی نہیں ہے۔ اس کا گھر بس چکا ہے وہ بدل گئی ہے آنٹی۔"

"فہد! اسے وقت دو پلیز۔"

"آنٹی! پچھلے تین ماہ سے پاگلوں کی طرح یہاں اس کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں۔ کچھ نہیں ملا مجھے۔ سب کچھ داؤ پر لگا ہے میرا گھر میرا کاروبار سب کچھ ــــ پوری زندگی داؤ پر لگا آیا ہوں اس کے لیے جس کے پاس مجھ سے بات کرنے کے لیے وقت نہیں' میں برداشت نہیں کر سکتا زیادہ۔ بس بہت ہو چکا ہے۔"

"تم اس کی زندگی کی آخری امید ہو۔"

"کیسے سمجھاؤں میں آپ کو کہ جو کچھ آپ سوچتی ہیں ویسا نہیں ہوتا ہے۔ وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔"

"وہ چھوڑ دے گی بے زار آجائے گی اس سے۔ کتنا بھاگے گی اس کے پیچھے۔"

"ٹکٹ بک کرالی ہے ہوٹل جا رہا ہوں۔ وہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"فہد! کچھ دن اور رک جاؤ۔"

"اب نہیں پلیز ــــ اب میں خود بہت اپ سیٹ ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے میرا یہاں رکنا میرے اور اس کے لیے کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔"

"اگر وہ خود تمہیں روکے۔"

"ناممکن ہے۔" وہ بیگ لے کر کمرے سے باہر نکلا۔

"اگر ایسا ہو جائے تو کیا تم رک جاؤ گے فہد؟" وہ پھر کسی امید کو لے کر اس کے پیچھے آئی تھیں۔

"تو میں رک جاؤں گا۔ مگر مجھے پتا ہے ایسا نہیں ہو گا۔" وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا۔

وہ تیزی سے ثانیہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

"ثانی! وہ جا رہا ہے اسے روک لو۔ پلیز اسے روک

لو۔ تم اس سے محبت کرتی ہو نا۔ لڑتی تھیں تم اس کے لیے۔ کئی کئی دن کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ وہ تمہارے لیے لوٹا ہے۔ اسے روک لو اپنے لیے۔"

"وہ سب ختم۔۔۔ ختم ہو چکا ہے؟" وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔

"کچھ ختم نہیں ہوا۔ جاؤ اسے روک لو۔ اس کے پیچھے جاؤ خدا کے لیے۔ وہ چلا جائے گا ثانی! وہ تمہاری آخری امید ہے۔ اسے روک لو! دیکھو تم نے ابھی تک اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ تم نے اس کی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ ثانیہ بیٹا تمہیں پھر سے موقع ملا ہے اپنی زندگی بنانے کا۔ جاؤ ثانیہ جاؤ۔"

وہ اسے پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"امی! چھوڑیں مجھے۔ سن چکی ہوں یہ سب۔"

"ثانیہ تمہیں میری قسم جاؤ۔ پلیز جاؤ۔ اسے روک لو۔"

"امی۔" وہ صدمے سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"اٹھو ثانیہ جاؤ۔" وہ اسے تقریباً" گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لے آئیں۔

"امی! ایسا مت کریں۔" وہ تکلیف سے انہیں دیکھے گئی۔

"ثانیہ! جاؤ میں نہیں چاہتی اب وہ جائے۔ اسے روک لو۔" وہ بے بسی سے دو منٹ تک دیکھتی رہی' پھر تیز تیز قدم سیڑھیوں سے اترنے لگی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر آہستہ آہستہ نیچے اتریں اور گلاس وال کے نزدیک رک گئیں۔

وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا جب ثانیہ اس کے پاس پہنچی۔

وہ حیران ہوتے ہوئے مڑا تھا اور پھر اس کا ہاتھ دروازے کو بند کرنے کے لیے بڑھا تھا۔ وہ دور سے اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ سکتی تھیں۔ ثانیہ کی پشت تھی اس طرف مگر وہ اندازہ لگا سکتی تھیں۔ ثانیہ اور فہد رک کر رسان سے بات کر رہے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا یہ دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی' جو تب انسان کے چہرے پر بکھرتی ہے جب اس کی کوئی بڑی خواہش پوری ہوتی ہے۔

سب کچھ جیسے ٹھیک ہو گیا تھا۔

مگر سب کچھ صحیح کے درمیان کبھی کبھی کچھ گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کوئی ایک کھوٹ رہ جاتا ہے جو انسان کے ذہین ترین دماغ سے بھی چوک جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں
تو مجھے زندگی سے پیارا ہے۔۔۔

گاڑی نے رفتار پکڑی تھی اور اس کا ہاتھ پلیئر پر رک گیا تھا

"یہ کیا لگا دیا ہے ثانی! میں تو سو رہا ہوں۔۔۔ اسٹیرنگ سنبھالو۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"چپ کر کے سنو۔۔۔ یہ سب تم میرے لیے کہہ رہے ہو یہ سمجھو۔"

"میں کبھی بھی اتنا بے سرا نہیں گا سکتا۔ بھول کر بھی نہیں۔"

"بکو مت۔ تم کبھی بھی اتنا سریلا نہیں گا سکتے۔۔۔ مگر مجھے سننے دو۔"

چھوڑ دوں میں پکڑ کر ہاتھ تیرا
بھول کر بھی نہ ایسی بھول کروں

اسد امانت علی کی گائیکی تھی' جو دل کے اندر اترتی جاتی تھی

"ثانی! ہم گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو چکے ہیں ستر سال کے۔"

وہ ایک آنکھ دبا کر گردن ڈھلکا کر بولا۔

جو ملی ہے خوشی تجھے پا کر
موتیوں میں ہے نہ ہیروں میں
نام تیرا غزل سے لکھا ہے
تیرے ہاتھوں کو ان لکیروں میں
دیکھ میں نے کس محبت سے
دھڑکنوں میں تجھے پکارا ہے
میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں

تو مجھے زندگی سے پیارا ہے

"میں تمہیں بیس سال بعد یہ گانا ضرور گا کر سناؤں گا ثانی! مگر ابھی یہ جبر نہیں کرو۔"

"بیس سال بعد بھی نہ تم اتنے باذوق ہو گے نہ ہی سریلے۔ اس لیے رہنے دو۔۔۔ یہ گانا میں اکیلے میں ہی سن سن کر خوش ہوتی رہوں گی۔" اس نے بے دلی سے پلیئر بند کیا۔

"چلو میں تمہیں اک اور گانا سناتا ہوں۔"

"میں نے کان بند کر لیے ہیں۔" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"دیوانہ تھا میں۔۔۔۔ دیوانہ یہ نہ جانا۔ میں نے یہ نہ جانا۔

بن جائے گا پھر افسانہ۔

یہ نہ جانا' میں نے یہ نہ جانا۔

وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہا تھا۔

"خدا کے لیے بس کر دو فہد۔۔۔ علی عظمت بے چارہ رو رہا ہو گا۔" اس نے ہاتھ ہٹا کر ہنس کر کہا تھا۔

"وہ پہلے کون سا خوشی خوشی گاتا ہے رو رو کر اور چیخ چیخ کر تو روتا ہے گاتا ہے۔"

"وہ تو گاتے وقت چیختا ہے۔ تم تو بلاوجہ چیختے ہو۔"

"تمہیں میرے چیخنے پر بھی اعتراض ہے۔ میرے گانے پر بھی' میرے اٹھنے بیٹھنے پر بھی۔۔۔ ہر اک بات پہ۔۔۔ میں کہتا ہوں لڑکی اک بار سوچ لو اپنے فیصلے پر۔"

"سوچنے کا وقت اب کہاں؟ انگوٹھی پہن لی' ایگریمنٹ کر لیا۔ بس اب دستخط باقی رہتے ہیں۔"

"کہو تو وہ بھی ابھی کروا لوں تمہارے بدلنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"

"رہنے دو۔ خود تو جا رہے ہو سیر سپاٹے کرنے۔۔۔ دستخط کرا دوں۔"

"سیر سپاٹے کرنے۔ ثانی! خدا کو مانو۔ پڑھنے جا رہا ہوں وہ بھی اسکالرشپ جیسی نعمت پر۔ اب ٹھکرا کر ناشکری کروں کیا۔"

"نہیں نہیں تم تو بہت شکر گزار بندے ہو رب کے میرے ملنے پر کتنے نفل پڑھے تھے بتاؤ۔"

"تم جب پوری طرح مل جاؤ گی دستخط کر کے تو سو پڑھ لوں گا۔"

"ہاں وحید مراد کی طرح جھوٹ موٹ کے دکھاوے کے۔"

"پرانی فلمیں ذرا کم ہی دیکھا کرو اچھا! بہت اثر ہو جاتا ہے تم پر پرانے گانوں فلموں کا۔"

"میں نے سوچا ہے ہم شادی کے بعد روز ایک زیبا محمد علی کی فلم دیکھیں گے مل کر۔" وہ پھر اسے چڑانے کے لیے کہنے لگی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لانگ ڈرائیو پر جائیں گے۔ روز سیر سپاٹے کریں گے۔ رات دیر تک سڑکوں پر پھرتے رہیں گے۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ آوارہ گردی کی زندگی گزارو گے شادی کے بعد بھی۔"

"پرانی سڑی ہوئی فلمیں دیکھنے سے تو یہی بہتر ہے۔۔۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں' اپنی سی ڈیز کا ڈھیر' اپنی کتابیں' کہانیاں' غزلیں وزلیں سب وہیں پھینک کر آنا' میں نہیں برداشت کروں گا۔ جان نکال دینے والے سر اور موٹی موٹی کتابیں' جن کی وجہ سے ابھی سے چشمہ لگ گیا ہے تمہیں۔"

"کتنے سخت قسم کے آدمی ہو تم کسی کی ذاتی دلچسپیوں پر حملہ آور ہوتے ہو۔ تم تو جینا حرام کر دو گے میرا۔ یہ نہ کرو یہ کرو۔ وہ نہ کرو وہ کرو اف۔ کتنی مشکل زندگی ہے شادی کی۔"

"اور میں یہ سوچ سوچ کر ختم ہو رہا ہوں کہ اتنی سڑیل' بدمزاج بور خاتون کے ساتھ مجھے پوری زندگی گزارنی ہے۔ ختم ہو گیا میں تو۔" اس نے مصنوعی افسوس سے کہا۔

"تو پھر ابھی سے سوچ لو۔ بلکہ کوئی فیصلہ کر کے ہی جاؤ۔"

"بلکہ ابھی کیوں نہیں۔ یہ لو اپنی پیتل کی انگوٹھی۔" اس نے انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا۔

"خبردار! جو اسے اتارنے کا کبھی سوچا بھی۔ سمجھ لینا اس دن فہد مر گیا۔"

"اللہ نہ کرے ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔"
"تم جو مجھے یہ اتار کر دے رہی ہو۔"
"پہن لیتی ہوں۔ ماؤں کی طرح بلیک میل مت کیا کرو۔"
"اور ہاں بار بار پیتل کی مت کہا کرو۔ سونے کی ہے یہ۔" اس کا اشارہ انگوٹھی کی طرف تھا۔
"اچھا چھوڑو نا کوئی اور بات کرو۔ بہت بولتے ہو۔"
"اوکے! آپ کہئے۔"
"آئس کریم کھلا دو۔"
"ریکارڈ خراب مت کروانا۔"
"فہد!" اس نے ایک مکا جڑ دیا اسے۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھ سے شیشہ گر کر ٹوٹا تھا' اور سب سے پہلا تھپڑ اسے تب پڑا تھا۔۔۔ پھر مار دھاڑ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔۔۔ وہ اس کا سوتیلا نہیں سگا باپ تھا۔ پہلے پہل وہ اسے ڈانٹتا تھا۔ نہ پڑھنے پر' اچھا ہوم ورک نہ کرنے پر پھر وہ اسے مارنے لگا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر۔

اور اس کی سوتیلی ماں نے کبھی بڑھ کر اسے چھڑایا نہیں۔ کبھی اس کی حمایت نہیں کی۔ کبھی اس پر رحم نہیں کھایا۔ حالانکہ وہ خود اسے نہ مارتی تھی' نہ جھڑکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اجنبیوں کا سا سلوک کرتی تھی ۔ نہ محبت نہ نفرت' اس نے کبھی شکایت لگاتے ہوئے بھی نہیں سنا اسے نہ بھڑکاتے ہوئے۔ وہ بس اپنے بچوں کی تعریفیں کرتی تھی۔ ان کے گن گاتی رہتی تھی ۔ زیشان اور ٹینا واقعی خوب صورت تھے اور خوب صورتی میں اپنی ماں پر گئے تھے۔ وہ ذہین بھی تھے۔ اچھا پڑھتے تھے اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے لیے اچھے اچھے کھلونے لاتا تھا۔ اک آدھ اس کے لیے بھی لے آتا۔ دو منٹ آرام سے بات کرلیتا۔ مگر وہ بیٹھ کر اس سے اس کے مسائل نہیں پوچھتا تھا۔ ضروریات پوری کردیتا۔ کھانا پینا دے کر اپنا فرض پورا کرلیتا اپنے تئیں۔ اس کا ہوم ورک چیک کرنے کے لیے آتا تھا' اور ہر بار خراب کارکردگی دیکھ کر اسے ڈانٹ کر کتابیں اس کے منہ پر مار کر چلا جاتا۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ کچھ کام مار سے نہیں پیار سے ہوتے ہیں۔

اس نے بہت دفعہ کوشش کی اچھا پڑھنے کی۔ مگر اس کا حافظہ کمزور تھا اسے چیزیں یاد مشکل سے ہوتی تھیں۔ وہ مکمل طور پر نکما اور نالائق نہیں تھا۔ بس اسے سبق یاد کرنے میں مشکل ہوتی تھی۔ وہ اس لیے شاید کہ سبق کے علاوہ اس کے ذہن میں کئی سوچیں ہوتی تھیں۔ دن میں ہر جگہ اپنی ماں کو ڈھونڈتے رہنا اور رات میں نیند سے اٹھ کر ڈر جانا۔ کئی بار وہ چیخیں مار کر اٹھتا تھا۔ اس کی چیخوں پر صرف ایک بار اس کا باپ آیا تھا۔ اسے خوب ڈانٹا اور چلا گیا۔ پھر اس کی چیخوں پر کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ چیخ کر کمبل سے منہ چھپا کر روتا رہتا۔ ہر رات خواب آتا۔ کوئی اس کی ماں کو اس سے چھین رہا ہے۔ وہ دس سال کا تھا جب اس کی ماں مرگئی تھی اچانک ہی ہنستے بولتے بات چیت کرکے وہ اس کے ساتھ آکر لیٹی تھی اور رات میں اچانک اسے درد اٹھا اور وہ چیختے چیختے مرگئی۔ اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ کی ناپسندیدہ بیوی تھی۔

اور تب ہی اس کے باپ نے ایک شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ دونوں بیویوں کو ایک الگ الگ گھر میں رکھا۔

جب اس کی پیدائش ہوتی تب بھی اس کا باپ نہیں آیا تھا۔ اس وقت اس کی چہیتی بیوی کی بھی طبیعت خراب تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد اس کا بھائی زیشان پیدا ہوا۔ جس کے پیدا ہونے پر مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ خوشیاں منائی گئیں۔

اس کا باپ کبھی کبھار جب خرچے کے پیسے دینے آتا تو اسے ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ اس سے کوئی ذاتی دلچسپی وابستہ نہیں تھی۔ بس وہ ضروریات پوری کردیتا تھا۔

پھر اس کی ماں نے جاب شروع کردی۔ وہ چار سال کا تھا۔ وہ اسے اسکول چھوڑ کر جاب پر جاتی واپسی میں اسے لیتی ہوئی آتی۔ اس کی ماں نے اس کے باپ سے خرچہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ ملنا جلنا ویسے ہی کم تھا اور بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

اسی طرح چھ سال گزر گئے۔ اس نے دو ڈھائی سال سے اپنے باپ کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ عنقریب اس برائے نام باپ کو بھول ہی جاتا اگر اچانک اس کی ماں اس دنیا سے نہ چلی جاتی۔

وہ کچھ عرصہ اپنے ننھیال میں رہا پھر ان لوگوں نے اس کے باپ کو بلوایا اور اسے اس کے حوالے کردیا۔ اس کا باپ اسے بے دلی سے گھر لے آیا۔ ایک بار سینے سے لگا کر پیار بھی کیا۔ اس کے لیے کھلونے بھی لایا۔ مگر اس کے دوسرے بچے اس کی توجہ کھینچ لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ پھر سے اس کا باپ اسے ایک کمرے میں چھوڑ کر بیگانہ ہوگیا تھا۔ وہ اسے چیزیں' کپڑے کتابیں لا دیتا تھا مگر اس کے ساتھ وقت نہیں گزارتا تھا۔

ماں کی وفات باپ کی لاپرواہی کے بعد ہی وہ ذہین پیارا سا بچہ۔۔۔ احساس کمتری کا شکار ہوتا گیا اور اس کا اثر اس کی ذہنی جسمانی صحت پر پڑتا گیا۔ وہ کمزور ہوتا گیا۔ سبق نہ یاد کرسکتا' رات میں اٹھ کر چیختا۔ چپ رہنا اور ہاتھ سے چیزیں گر کر ٹوٹنا اس کا معمول بنتا گیا' مدثر احمد بارہ سال کی عمر سے ان کیفیات میں مبتلا ہوتا گیا۔ اور تب اس کا علاج نہ دوا سے ہوا نہ محبت سے۔

☼ ☼ ☼

اس کے لوٹتے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ مگر اس کے آتے ہی پھرتی سے آنکھیں کھول کر آرام کرسی روک کر اسے دیکھنے لگے۔

"السلام علیکم ابو۔۔۔ کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" وہ فکر مندی سی ان کی طرف بڑھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا میں۔ اتنی دیر کیوں ہوگئی تمہیں گیارہ بج رہے ہیں۔" ان کے لہجے میں خفگی تھی۔

"وہ ابو! دراصل ہم باتیں کرتے کرتے کافی دور نکل گئے تھے۔ واپسی میں دیر ہوگئی۔"
"کس وقت گئی تھیں تم۔"
"آٹھ بجے شاید۔"
"اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی۔"
"آپ کو میرا جانا برا لگا یا فہد کے ساتھ جانا۔"
"نہ جانا' نہ فہد کے ساتھ جانا' بےوقت جانا اور بے وقت لوٹنا برا لگا' صرف برا کیا بلکہ افسوس ہوا۔۔۔ دکھ بھی کہہ سکتے ہیں۔" ان کا لہجہ ہلکا تھا مگر دکھی اور بے بس سا۔

"فہد میرا منگیتر ہے ابو! بہت شریف انسان ہے مجھے بھروسا ہے اس پر۔ آپ کو بھی ہونا چاہیے مجھ سمیت اس پر۔"

"گھومنے پھرنے کے مواقع شادی کے بعد بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے اعتماد ہے مگر یہ سب زیب نہیں دیتا اس وقت۔"

"وہ دو چار دن میں باہر جا رہا ہے۔ بتایا تو تھا کہ اس کے ساتھ جا رہی ہوں' آپ کو برا لگا تھا تو منع کردیتے میں نہیں جاتی۔"

"آئس کریم کھانے کی بات کی تھی بیٹا! میں نے سوچا گھنٹے بھر میں واپسی ہوجائے گی پھر فہد کے سامنے انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔ اچھا ہوتا تم خود منع کردیتیں۔"

"مجھے کیا معلوم کہ آپ مجھ سے کیا توقع کر رہے ہیں۔ آپ نے نہیں روکا تو میں چلی گئی۔ مجھے خود احساس نہیں تھا کہ دیر ہوجائے گی اتنی۔"
"باتیں گھر پر بیٹھ کر بھی ہوسکتی ہیں۔" ان کا لہجہ ملامت کرنے والا ہوگیا تھا۔
"مجھ سے غلطی ہوگئی۔" اس نے بیزاری سے کہا تھا۔
"آئندہ نہیں ہونی چاہیے۔" ان کا رخ اب دوسری جانب تھا۔ وہ سگریٹ سلگا رہے تھے۔
"نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ دو دن بعد جا ہی رہا ہے۔

کوشش کروں گی کہ اسے سی آف کرنے نہ جاؤں۔"

"ابزیوڈش۔" وہ سگریٹ کے کش لینے لگے۔

"مجھے پتا ہے وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے اتنا برا اور غلط سمجھیں۔"

"میں نے اسے کچھ نہیں سمجھا نہ کہا اور وہ مجھے اچھا لگے یا نہ لگے، تمہیں لگتا ہے تمہاری ماں کو لگتا ہے۔ کافی ہے۔"

"مجھے آپ کی ان باتوں سے تکلیف ہوتی ہے ابو!"

"مجھے بھی تمہارے رویے اور لاپروائی سے تکلیف ہوتی ہے۔"

"آپ مجھ پر بھروسا نہیں کرتے۔" اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

"تم میری کوئی بات نہیں مانتیں۔ نہ سنتی ہو نہ سمجھتی ہو۔"

"آپ کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایتیں رہیں گی؟"

"تم اگر میری کوئی بات سمجھو تو شکایتیں مٹ بھی سکتی ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے میں آپ کو کبھی خوش نہیں کر پاؤں گی۔" وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بڑبڑائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی کیفیت نہیں تھی مگر دل بے حد ڈرا ہوا بے چین تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک ہوتا تھا مگر بہتر تھا کہ اس کے چند حقوق پورے ہو رہے تھے۔ کچھ ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ اچھے نمبر نہ لانے پر بھی اسے اچھے اسکول میں ہی رکھا گیا۔ اسے کھانا پینا مل رہا تھا۔ پہننا اوڑھنا۔ بس جو نہ تھا وہ احساس نہ تھا محبت اور شفقت کا۔ وہ کسی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی سے اپنی سوچیں نہیں شیئر کر سکتا تھا۔ وہ جب راتوں کو چیختا تھا تو کوئی اسے چپ کرانے کے لیے نہیں آتا تھا۔ وہ روتا تو کوئی اس کے آنسو نہیں صاف کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے رونا بند کر دیا اور سارا سمندر اس کے اندر جمع ہوتا گیا آنسوؤں کا۔

اسے یاد تھا ایک بار اس نے بھی ذیشان کی دیکھا دیکھی کہا تھا کہ میں بھی ڈاکٹر بنوں گا۔ اصل میں اس کے پاس زندگی کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ اس کی ماں نہیں تھی جو رات کو سلاتے وقت اسے خواب دکھاتی بڑا آدمی یا ڈاکٹر انجینئر بننے کا اس نے بھی سوچ لیا۔ کئی دنوں تک سوچتا رہا پھر جب میٹرک کلیئر کر لیا تو اس کے باپ نے پوچھا اور اس نے کہا ڈاکٹر بنوں گا۔

پہلی بار اس کی سوتیلی ماں نے رد عمل کیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"احمد! اس کا اتنا دماغ ہے کہ ڈاکٹر بن سکے۔ نمبر دیکھے ہیں آپ نے پرسینٹ ایج دیکھی ہے۔ اس کے لیے بہت دماغ اور بہت پیسہ چاہیے بچے۔ آپ کے ابا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ ذیشان ڈاکٹر بنے گا۔ آپ انجینئرنگ پڑھ لو۔ اس کا بھی تو بہت اسکوپ ہے۔ اب اگر ڈاکٹر نہ بن سکے تو سارا پیسہ پانی میں گیا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم بی ای کر لو یا آئی ٹی پڑھ لو۔ کوئی مناسب ملازمت مل جائے گی۔ ویسے بھی یہ فلیٹ تو میں نے تمہارے نام کر دیا ہے۔" اس کے باپ کا رویہ ٹھنڈا تھا۔

"احمد! آپ نے کب ایسا کیا۔ مجھے بتائے بغیر۔" وہ اچانک بپھری تھی۔

"ذیشان اور ثنا کے نام وہ دونوں پلاٹ ہیں اور رقم بھی تو رکھی ہوئی ہے۔ سونا بھی تم نے جمع کیا ہے۔ یہ بھی میرا بیٹا ہے اس کے لیے بھی مجھے کرنا ہے کچھ نہ کچھ۔"

"اتنا کچھ تو ہو رہا ہے اس کے لیے۔ کسی چیز کی کمی ہے اسے۔ پوچھ لیں سب کچھ تو میں دیتی ہوں اسے۔ میں نے سمجھا آپ نے یہ فلیٹ میرے نام کیا ہو گا۔ میرا سب کچھ بھی تو آپ کے بچوں کا ہے۔"

"دیکھو تو یہ سب کچھ تو تم لوگوں کا ہے۔ اب ایک فلیٹ ہی کیا ہے اس کے نام۔ شرعی حق ہے اس کا میرے اوپر، پھر میرے اور بچے ذہین ہیں وہ اپنی محنت سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیں گے۔ یہ اگر اچھا نہ پڑھ سکا اور اسے اچھی ملازمت نہ مل سکی تو کم از کم اس کے پاس ٹھکانہ تو اپنا ہونا چاہیے۔"

پہلی بار اس نے باپ کے چہرے پر اپنے لیے فکر مندی دیکھی تھی۔ پہلی بار اسے لگا وہ اسی کا باپ ہے۔ وہ جیسا بھی ہے اسے پیار نہیں کرتا مگر سوچتا ضرور ہے اس کے لیے۔ پہلی بار وہ خوش اور مطمئن تھا۔

اس نے اپنے باپ سے کچھ نہ کہا۔ وہ بڑھ کر ان سے لپٹ جانا چاہتا تھا مگر وہ یہ نہ کر سکا۔ البتہ اس کا دل کچھ صاف ضرور ہو گیا تھا باپ کی طرف سے۔ اس نے سوچا آہستہ آہستہ وہ باپ سے قریب ہو جائے گا۔ وہ بلاوجہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھتا تھا تاکہ کسی بہانے وہ اس سے بات کریں۔ مگر ان کے دوسرے بچے کہاں یہ موقع دیتے تھے۔ وہ انہیں گھیر لیتے تھے۔ وہ چپ چاپ اٹھ آتا اپنے کمرے میں۔ غیر محسوس انداز میں ایک کونے میں پڑا رہتا۔

مگر اسے چھوٹی سی تسلی تھی ضرور کہ اس کا کوئی تو ہے جو اس کے لیے اچھا سوچتا ہے۔ اس خوشی اور سکون میں وہ انہیں خوش کرنے کے لیے پڑھتا رہا مگر یہاں اسے ذہن میں رکھنے میں پرابلم ہوتی تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے کہیں کھو جاتا تھا۔ وہ ٹھیک طرح سے کام نہیں کر پاتا تھا۔ مگر اب اس کی کارکردگی کچھ کچھ بہتر ہو رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں آگیا تھا۔

پھر اس کیفیت کو اس حادثے نے اور بڑھا دیا۔ اس کے سر سے نام نہاد باپ کا سایہ بھی چھن گیا۔ اس کا باپ حادثاتی موت کی نذر ہو گیا اور وہ بھرے سے بھرے جہاں میں اکیلا، بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ ان کی ماں تھی۔ اس کی سوتیلی ماں کے پاس ان کے بچے تھے۔ مگر ایک وہ تھا جس کے پاس نہ اپنے سگے بہن بھائی تھے نہ ماں تھی اور نہ اب باپ تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے۔ فہد کے فون آرہے ہیں تم اس سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟" وہ کمپیوٹر پر بے دلی سے کوئی ویڈیو دیکھ رہی تھی جب وہ اندر آئی تھیں۔

"دل نہیں چاہ رہا۔"

"ثانیہ..... کیا مسئلہ ہے کوئی لڑائی ہوئی ہے اس کے ساتھ کیا؟"

"امی! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"ثانیہ! سیدھی طرح بتاؤ۔ ادھر منگنی ہوئی ہے ادھر مسائل شروع۔"

"امی! وہ ملنے کے لیے ضد کرتا ہے اور میں نہیں مل سکتی۔"

"اس دن تو گئے تھے تم لوگ ڈرائیو پر۔"

"ابو کو اچھا نہیں لگتا میرا اس سے ملنا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا۔ وہ منگیتر ہے تمہارا۔ کل کو شادی ہو گی۔"

"وہ ہماری اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔"

"نہیں چھوڑو۔ تم تو خوش ہو نا بس کافی ہے۔"

"امی! ابو کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ مجھے اتنا امیچور اور لاپروا کیوں سمجھتے ہیں۔ کیوں وہ میرے بارے میں اتنے تنگ نظر ہو جاتے ہیں کبھی کبھار۔"

"ان کا کوئی قصور نہیں بیٹا! وہ جس کلاس سے اٹھ کر آیا ہے وہاں یہی سب ہوتا ہے۔ شادی کے شروع شروع میں اس کا میرے ساتھ بھی یہی رویہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا دماغ درست کیا۔ اب تمہیں کیوں پریشان کرتا ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔"

"نہیں امی پلیز! وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔"

"تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے، نہیں ناراض ہو گا۔"

"امی! وہ میرے باپ ہیں۔ مجھے پروا ہے۔ میں نے منگنی کرتے ہوئے بھی دس بار ان سے پوچھا۔ ان کو منایا، مگر وہ کب اچھا سوچیں گے۔ ان کے اندر جیسے کوئی ڈر سا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بچپن سے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں نہیں جانا۔ یہ نہیں کرنا۔ اس سے بات نہیں

کرنی۔ لڑکوں سے دوستی نہیں کرنی وغیرہ۔"

"وہ بوڑھا ہو گیا ہے' پر سدھرا نہیں۔ خوف کا اثر ہے۔"

"آپ پلیز انہیں کچھ نہ کہیے گا۔ وہ اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔"

"تم رہنے دو۔ بات کرو فہد کے ساتھ۔ کل تو جا رہا ہے وہ۔ مل لو شام کے وقت یا پھر سی آف کرنے چلی جانا۔"

"ہم سب مل کر جائیں گے۔ ابو کو بھی لے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں وہ یہ نہ سوچیں کہ میں ان کی کوئی بات نہیں مانتی۔"

"اوکے۔۔۔" وہ لمبی سانس لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

"احسان! تم نے ثانیہ سے کیا کہا ہے؟" وہ بڑے غصے میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"اس نے کوئی شکایت لگائی تم سے۔" وہ کتابوں کے ریک میں اپنا چشمہ ڈھونڈ رہے تھے۔

"احسان! میں سمجھتی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم بدل جاؤ گے' پر ایسا نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ وہی رہو گے کنویں کے مینڈک۔"

"میں بھی تمہارے بارے میں یہی سوچتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تم میں بردباری' سنجیدگی اور فہم آجائے گا مگر شاید ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غلط توقعات رکھتے آئے ہیں ابھی تک۔"

"مجھے ان بے کار کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"اسی کا تو جواب دے رہا ہوں۔" انہیں ایک کتاب کے نزدیک اپنا چشمہ مل گیا تھا' وہ کتاب ریک سے نکال کر چشمہ پہن کر کرسی پر آبیٹھے۔

"کیوں اپنی اولاد پر بے جا پابندیاں لگا رہے ہو اور ان کی زندگی خراب کر رہے ہو تم۔"

"رخسانہ! زندگی بنا رہا ہوں اپنی بچی کی۔۔۔ خراب نہیں کر رہا۔۔۔ دیکھو وہ بچی ہے۔ بیس بائیس سال کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی ہے۔ ٹین ایج میں بچے بہت خواب دیکھتے ہیں۔ سب کچھ حسین اور آسان لگتا ہے۔ یقین کرو میں اس کی یہ حسین دنیا فہم و فکر اور پریشانی کی نظر نہیں کرنا چاہتا۔ جب ہی جہاں اس نے کہا میں نے منگنی کروادی۔ اب تک سب کچھ اس کی مرضی سے ہوا ہے اور ہو گا۔ مگر کچھ دائرے' کچھ لمٹس کچھ رولز ہوتے ہیں زندگی کے اور رشتوں کے۔"

"احسان! یہ ہمارا دور نہیں ہے۔ اکیسویں صدی ہے۔ چیزیں بدل گئی ہیں۔ ہمارے بچے ایسا نہیں سوچتے۔ ان پر بے جا پابندیاں مت لگایا کرو۔ کب سمجھو گے تم۔ اب یہ مت کہنا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کو سمجھاتے رہیں گے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"کچھ نہیں کہتا۔۔۔ دیکھو میں نے جو کہا اسے ٹھیک کہا' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی اس پر پابندیاں لگا رہا ہوں یا پھر میں اس پر بھروسا نہیں کرتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے رخسانہ بیگم! اگر پھر بھی اسے شکایت ہے تو میں بات کر لوں گا۔"

"کیا بات کرو گے تم اس سے' وہ تو اس فکر میں ہلکی ہو رہی ہے کہ میرا باپ مجھ سے خفا ہے۔ اسے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اسے میرے ملنے پر اعتراض ہے۔ میں فہد کو سی آف کرنے نہیں جاؤں گی وغیرہ۔ تم نے اتنا کنفیوژڈ اور پریشان کر دیا ہے بچی کو۔"

"وہ یہ کہہ رہی ہے؟" چشمے کے پار ان کی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔

"ہاں اور اب تم اس خوشی میں رہو کہ تم کامیاب ہو گئے اسے ہراساں کرنے میں۔"

"میں مطمئن ہوں کہ اسے پروا ہے۔ وہ لاپروا نہیں ہے بس تھوڑی سی کم عقل ہے۔ مگر ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔ میں مل لیتا ہوں اسے۔ کہاں ہے کمرے میں؟" وہ کتاب بند کر کے اٹھے۔

"کوئی ضرورت نہیں ابھی جائے گی۔ فہد سے بات کر رہی ہو گی کل سے فون نہیں اٹھا رہی تھی اس کا میں کہہ کر آئی ہوں۔"

"تم جو ہو نا رخسانہ بیگم! تم میری ساری محنت اور تربیت پر پانی پھیر دینا اچھا۔" وہ نہ چاہتے ہوئے پھر بیٹھ گئے۔

وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ اٹھے کتاب رکھی۔ دروازے کے پار جھانکا۔ وہ نہیں نظر نہ آئیں تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے کمرے تک چلے آئے جہاں وہ سیل فون ہاتھ میں لیے افسردہ سے انداز میں بیٹھی تھی۔

"کیا میں نے اپنے بچے کو ڈسٹرب کیا۔" وہ دروازے کے پاس ہی کھڑے تھے۔

"بالکل نہیں' آپ آجائیں اندر۔"

"فہد کیسا ہے۔ کیا بات ہوئی۔ اس نے سی آف کرنے کے لیے کہا ہو گا۔"

"جی مگر' کہا سب آجائیں۔"

"یہ تم نے کہا ہو گا۔ میں جانتا ہوں۔ بیٹا! میں سوری کروں تو کیا خیال ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ سوری کریں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"تم مجھے خوش کر سکتی ہو۔ اس رات تم نے غلط کہا تھا کہ میں آپ کو خوش نہیں کر سکتی۔"

"میں آپ کو خوش کر سکتی ہوں۔"

"ہاں بالکل میں کوئی دنیا کا مشکل ترین بندہ نہیں جسے خوش کرنا اتنا مشکل ہو۔ بہرحال یہ بتاؤ کل چلنا ہے اسے چھوڑنے؟"

"ہم سب جا رہے ہیں' آپ کو کوئی اعتراض؟"

"نہیں کوئی اعتراض نہیں ہے' چلیں گے۔ وہ پورے چار سال کے لیے جا رہا ہے۔ تب تک تم پڑھائی مکمل کر لو گی۔ باقی کے دو سال کیا کرو گی۔"

"کوئی جاب کر لوں گی' گھر کے کام کاج سیکھ لوں گی۔"

"اچھا خیال ہے۔ سارے کام آنے چاہئیں۔ میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے نا۔"

وہ ہنسی تھی ان کی بات پر۔

"کل ہم فہد کے لیے تحفہ خریدیں گے۔ پھر ایئر پورٹ پر جائیں گے اس سے ملنے کے لیے۔"

"پھول آپ لے لیجیے۔ تحفہ میں دے دوں گی۔"

"میں کوئی اس عمر میں پھول دیتا اچھا لگوں گا۔" وہ شرارت سے مسکرائے۔ پھر دونوں ہنس دیے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

پھر شام میں وہ اسے بازار لے کر گئے۔ تحفہ لیا اور صبح اس کی طرف جاتے ہوئے پھول لیے۔ اسے بہت اچھی طرح سی آف کیا تھا اور شام کو گھومتے پھرتے گھر آگئے۔

☼ ☼ ☼

رات سوتے وقت اسے احساس ہوا۔ وہ فہد کو بہت مس کرے گی۔ پورے چار سال اس انتظار میں گزارنے تھے۔ حالانکہ اس روز کے بعد وہ روز اس سے بات کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی روٹین سیٹ ہوتی گئی۔

اور پھر دو سال کچھ مشکل سے مگر گزر ہی گئے تھے وہ اب گھر کے کام سیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ جاب ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے کسی طور یہ دو سال گزارنے تھے۔ بہت مصروف رہ کر' تاکہ وہ اسے کم کم یاد آئے اور اسے دو سال گزارنے کا احساس نہ ہو۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا یہ دو سال پچھلے دو سال کی طرح نہیں گزرنے تھے۔

اس دن اس کی سالگرہ تھی جب فہد اسے پہلی بار وش کرنا بھول گیا۔ وہ پورا دن انتظار کرتی رہی۔ وہ اس سے بات چیت بھی کم کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی مصروفیت جانتی تھی۔ وہ وہاں اپنے چچا کے بزنس میں حصہ لے رہا تھا۔ پڑھ رہا تھا اور بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی مصروفیتوں کا اندازہ تھا۔ وہ اس سے بار بار شکایت کر کے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت میچور اور کم گو ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں تھوڑا بہت صبر آگیا تھا۔

مگر اتنا نہیں کہ وہ اتنی بڑی بات سہہ جاتی۔ اتنی

www.paksociety.com

آسانی سے وہ بھی۔ اس نے فون کیا تھا اور اتفاق سے کسی خاتون نے اٹھایا تھا جو خود کو فہد کی بیوی بتا رہی تھی۔ اس کے کتنی دیر تک وہ کچھ بھی کہنے سننے کے قابل نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

باپ کے جانے کے بعد اس کی زندگی اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ جیسے تیسے پڑھائی مکمل کی اور جاب کی تلاش میں لگ گیا۔ ذیشان مزید پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ ثینا کی شادی ہو گئی تھی اور اس کی سوتیلی ماں بھی اپنی بہن کے پاس باہر چلی گئی۔ اب اکیلا رہ گیا وہ جو پہلے سے ہی اکیلا تھا۔ مگر آج سے پہلے روزگار اور کھانے پینے کی اتنی ٹینشن نہ ہوئی تھی جتنی اب ہو رہی تھی۔ اس کا بیلنس زیرو تک پہنچ گیا تھا۔ جو پیسہ باپ نے اس کے لیے جمع کیا تھا وہ سارا اس کی پڑھائی، کھانے پینے کے اخراجات کی نذر ہو گیا تھا۔ اب مزدوری بھی مل جاتی تو اسے کرنا تھی۔

اس نے گھر کی اور اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنا شروع کر دیں۔ خوراک کی مقدار گھٹا دی تھی۔ کبھی کھاتا، تو کبھی بغیر کھائے سو جاتا، ماہانہ بل کی الگ ٹینشن تھی۔ اس نے اس دوران ایک بار بھی اے سی نہیں چلایا۔ نہ گیس زیادہ استعمال کی۔ اچھے درجے سے وہ زندگی کے نچلے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ بس ایک آسرا تھا کہ گھر اپنا تھا، جہاں سے کوئی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ ڈگری لے کر دفتروں کے دھکے کھانا معمول سا بن گیا تھا۔ مگر کہتے ہیں خدا کبھی کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا اس دن اگر احسان صاحب اسے اس دفتر میں انٹرویو کے دوران نہ ملتے۔

وہ احمد کے یونیورسٹی فیلو رہ چکے تھے اور اچھے دوست بھی۔ اس کے پورے تعارف کے بعد وہ بہت دیر تک اسے ساتھ لگائے باتیں کرتے رہے، پھر اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر بھی آئے۔ آخری مرتبہ وہ احمد کی وفات پر آئے تھے احمد کے آبائی گھر۔ تب ہی وہ بھی آج احسان صاحب کو پہچان گیا۔ انہیں اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا اور ٹھیک دو دن کے بعد وہ اس کے لیے نوکری کا بندوبست کر چکے تھے اپنے دفتر میں۔

پھر جاب کے دوران اس کی محنت اور ایمان داری سے وہ بہت متاثر ہو گئے تھے۔ البتہ اس کا کام کرتے ہوئے گم ہو جانا ذہنی پریشانی اور اضطراب کو وہ محسوس کر گئے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس ساری کیفیت کا سبب اس کی تنہائی ہی ہے۔ وہ کئی بار اسے شادی کا مشورہ دے چکے تھے اور وہ ہر بار آسانی سے ٹال دیتا۔ اس حوالے سے نہ کبھی اس نے سوچا تھا، نہ سوچنا چاہا، نہ اسے کوئی لڑکی پسند تھی، نہ ہی کسی لڑکی نے اسے پسند کیا تھا۔ البتہ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی لڑکی ضرور ڈھونڈیں گے اور ایک دن تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر حیران ہی کر دیا کہ۔۔۔

"مدثر احمد۔۔۔ میری بیٹی ثانیہ سے شادی کرو گے؟"

اور وہ حیرانی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

فہد نے کئی بار کال کی، شاید اپنی صفائی دینے کے لیے یا پھر مجبوریاں بتانے کے لیے۔۔۔ مگر اس نے ایک کال بھی ریسیو نہیں کی تھی۔ اس کے پاس کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پورے چار ماہ اس نے جیسے سکتے کی حالت میں گزارے، اسے اس دھوکے کو یقین کرنے میں بہت وقت چاہیے تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو گئی۔ مگر دل جیسے بجھ گیا۔ ہر طرف سے اعتبار اٹھ گیا۔ ایسے میں اس کے باپ نے ایک بار اسے پاس بٹھا کر ایک عجیب فرمائش کر دی۔ شادی کرنے کی۔ وہ بھی ان کی چوائس پر۔ اس نے انکار کر دیا، مگر ان کا اترا ہوا چہرہ اور فکر مندی، محبت دیکھ کر اسے سوچنا پڑا۔۔۔ پہلے اس کے باپ نے اس کی مانی تھی۔ اب باری اس کی تھی، حالانکہ اس کا ارادہ اب شادی کرنے کا نہیں تھا۔ مگر باپ کی خواہش پر تیار ہو گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا، جیسا بھی تھا، اسے اس سے کوئی

غرض نہیں تھی۔ وہ بس اپنے باپ کی خواہش پر مان گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ صرف درخواست کی تھی۔ خواہش کا اظہار کیا تھا اور بس۔ وہ چاہتی تو سہولت سے منع کر دیتی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ جو اس رشتے کے سخت خلاف تھی اور اس کے پاس انکار کے مناسب دلائل بھی تھے۔ نہ لڑکے کی جاب اتنی اچھی تھی، نہ کوئی کاروبار تھا۔ وہ ایک درمیانے درجے کا درمیانی کمائی والا عام سی شکل صورت کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں نے بہت شور مچایا۔ اسے سمجھایا کہ وہ خوش نہیں رہ پائے گی وہاں دو کمروں کے ایک معمولی سے فلیٹ میں ایک معمولی آدمی کے ساتھ جس کی آمدنی بھی معمولی ہے۔ مگر اس کا باپ کہتا تھا خوشی کا تعلق پیسوں سے نہیں انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ سکون شرافت میں ہے، خودداری میں ہے۔

اور وہ ابھی تک صرف یہ جان پائی تھی کہ خوشی کا تعلق صرف اور صرف دل کے ساتھ ہوتا ہے، جو ابھی خاموش تھا۔

اور پھر ثانیہ احسان اور مدثر احمد ایک دوسرے کی زندگی میں آ گئے۔

ثانیہ سے زیادہ تو وہ شرما رہا تھا۔ ثانیہ کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی، مگر اس کا گھبرایا ہوا انداز دیکھ کر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔

"یہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میری امی کی تھی۔ ان کی کچھ چیزیں مجھے دادی نے دی تھیں، ان میں سے یہ انگوٹھی خالص گولڈ کی ہے۔" وہ انگوٹھی ہاتھ میں لیے بجائے اس کی تعریف کرنے کے انگوٹھی کی خصوصیات بتا رہا تھا۔

"میں آپ کو پہنا دوں؟" پتا نہیں کیسے جھجک کر اس نے کہہ ہی دیا۔

"میں خود پہن لوں گی۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"بہت اچھا۔" اس نے خوشی خوشی انگوٹھی کی ڈبیا اس کے حوالے کر دی، جو اس نے لے کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی۔

"یہاں سے گم تو نہیں ہو گی؟" وہ اچانک بولا۔

"یہاں اور کون کون رہتا ہے؟"

"کوئی نہیں، صرف میں اکیلا۔"

"آپ اسے گم کریں گے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر کیسے گم ہو گی؟" اس پر بے زاری سوار تھی۔

"پھر واقعی نہیں ہو گی۔" وہ اس کے اکھڑے اکھڑے رویہ کی وجہ سے سہم سا گیا تھا۔

"میں چینج کر لوں۔" وہ پوچھ نہیں رہی تھی، بتا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بلاوجہ مسکرایا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ وہ بھاری شرارہ سنبھالتے ہوئے اٹھی اور کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو وہ جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی پوزیشن میں۔

اس نے چہرہ صاف کیا۔ کریم لگائی بال باندھے، شرارہ ہینگ کر کے رکھا۔ وہ بغیر کوئی حرکت کیے وہیں بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔

اسے عجیب الجھن ہونے لگی۔ "کیسا آدمی ہے" وہ بڑبڑائی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"چینج نہیں کرنا کیا؟" شادی کی پہلی رات وہ ایسے پر اعتماد تھی جیسے عموماً" آدمی ہوتے ہیں۔

"کرنے ہیں۔" وہ جیسے خواب سے جاگا تھا۔

"تو پھر جایئے۔"

"کہاں؟"

"کپڑے لے کر واش روم میں۔۔۔"

"اوہ ہاں۔۔۔" وہ کتنی دیر تک واش بیسن کے سامنے کھڑا اپنی شکل دیکھتے ہوئے عجیب غریب سوچوں میں گم رہا۔

وہ کتنی دیر تک بیٹھی رہی، پھر خیال آیا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھا، پھر باہر نکل آئی، کچن میں رکھے فریج سے دودھ کا ڈبا نکالا۔ دودھ گرم کیا اور بریڈ لیے وہ کمرے میں چلی آئی۔ پورا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور وہ بندہ ابھی تک واش روم میں تھا۔ اسے کچھ فکر سی ہونے لگی۔ وہ کھانے سے پہلے اٹھی، دروازہ ہلکا سا بجایا۔

"جی۔۔۔" دو چار مرتبہ کھٹکھٹانے پر اندر سے ہلکی سی آواز آئی۔

"سب خیریت ہے؟" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔" وہی سہما ہوا لہجہ۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر صوفے پر آ بیٹھی اور دودھ کے ساتھ بریڈ لینے لگی۔ وہ دو چار منٹ بعد باہر آ گیا۔ چہرہ تھپتھپا کر ہلکی کنگھی کی اور اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کھا رہی ہیں۔" اسے کچھ اور تو نہیں سوجھا' یہ پوچھ لیا۔

"پی رہی ہوں۔ وہ بھی نظر آ رہا ہو گا گلاس سے۔"

"جی۔۔۔ بھوک لگی ہے؟"

"ظاہر ہے۔" وہ لاپروائی سے پورا گلاس خالی کر کے اٹھی۔

"اور لا دوں؟" عجیب معصومیت تھی۔

"نہیں بس ٹھیک ہے' میں رات کو اتنا نہیں کھاتی۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ بلکہ مسکرانے کی کوشش کی۔

"نیند آ رہی ہے۔۔۔ بتی بند ہو سکتی ہے؟"

"جی بالکل۔" وہ اٹھا اور لائٹ بجھا دی۔

اس نے لیٹ کر چادر تان لی اور وہ بیٹھا رہا۔

"مسٹر مدثر!" اسے عجیب غصہ آ رہا تھا اس آدمی پر۔ بات نہ کرتا' مگر ایسے غائب الدماغی سے کیوں بیٹھا تھا۔

"جی ثانیہ جی۔" وہی لہجہ۔

"آپ کو سونا ہے یا ساری رات بیٹھے رہیں گے۔"

"میں سو جاؤں یہیں۔" عجیب الجھن۔

"مرضی ہے آپ کی' مگر بہرحال سو جایئے۔" وہ ہنس پڑی تھی بے ساختہ۔

"کیا ہوا۔" وہ اور پریشان ہو گیا اس کے ہنسنے پر۔

"کچھ نہیں۔۔۔ روز آپ اسی طرح سوتے ہیں' کسی کے کہنے پر۔"

"نہیں تو' خود بخود سو جاتا ہوں۔"

"تو آج بھی خود بخود ہی سو جائیں۔" وہ بے وجہ ہنس دی۔

"جی۔۔۔ میں آپ سے ڈر رہا تھا۔"

"کیوں۔۔۔ میں چڑیل لگ رہی ہوں کیا۔"

"نہیں تو آپ چڑیل نہیں لگ رہی ہیں۔"

"پھر اچھی لگ رہی ہوں کیا۔" اسے خوامخواہ میں مذاق سوجھا۔

"جی یہ تو ہے۔۔۔ آپ اچھی لگ رہی ہیں۔"

"تعریف کا شکریہ۔" وہ کچھ فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر لیٹ گیا۔

شادی اتنی بھی بھیانک نہیں' جتنا لوگ کہتے ہیں۔ کچھ مرد تو بالکل بے چارے ہوتے ہیں۔ ویسے اچھا ہی ہے وہ کروٹ بدلے لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔

اور وہ تو عجیب سوچوں میں غرق تھا' جب اس نے تھوڑی دیر بعد ثانیہ کو بے خبر سوتے دیکھا۔

یہ تھی مدثر احمد کی شادی کی پہلی رات۔ پہلی عجیب رات۔

☼ ☼ ☼

وہ ولیمہ کا دن تھا' جب وہ تیار ہو کر بیٹھی تھی امی کے انتظار میں۔ وہ آتیں تو اکٹھے جاتے ہال میں۔ وہ چینج کر کے کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ اسی طرح چپ چپ سا' کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا ہوا؟" وہ سیل فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بلاوجہ ہی گھبرا گیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھی لگ رہی ہوں کیا؟" وہ کل سے اس کا امتحان لے رہی تھی۔

"ہم۔۔۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

"شکریہ۔۔۔" وہ ہنستے ہوئے نمبر ملانے لگی۔

"جی امی۔۔۔ آ جائیں میں تیار ہوں۔ اچھا پہنچنے والے ہیں' ٹھیک ہے۔"

"وہ لوگ پانچ منٹ میں پہنچنے والے ہیں' گیٹ کھول دیجیے جا کر۔"

"اچھا۔۔۔" وہ روبوٹ کی طرح اشارے پر اٹھ کر باہر چلا گیا اور وہ حیرت سے اسے جاتے دیکھ کر سوچتی رہی کہ یہ ہمیشہ سے ایسا ہے یا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ شاید یہ بھی میری طرح شادی سے خوش نہیں ہو گا' کسی اور کو پسند کرتا ہو گا۔ اس کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے۔ مگر کس نے کی یہ زبردستی' اس کے والدین تو نہیں ہیں۔ شاید لڑکی نے ہی انکار کر دیا ہو۔ ذہنی صدمہ لگتا ہے۔ وہ مزید کچھ سوچتی اس سے پہلے وہ لوگ آ گئے تھے۔

"کیا حال ہیں بچے؟" سب سے پہلے ابو کمرے میں آئے تھے۔

"ابو جی۔۔۔" وہ اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ "بہت برے ہیں آپ بیٹی کو رخصت کر کے بھول گئے' فون بھی نہ کیا مجھے۔"

"ارے بھئی یاد ہی نہیں رہا۔"

"کیسے یاد نہیں رہا' پوری رات جاگتے رہے ہیں تمہیں یاد کر کر کے۔ بچوں کی طرح روئے تھے رخصتی کے بعد۔" امی مدثر کے ساتھ اندر آئی تھیں۔

"رخسانہ بیگم۔" وہ انہیں ٹوکنے لگے۔ "اچھا چھوڑو چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ ہال میں مہمان تو پہنچ گئے۔ میزبان مہمانوں کی طرح لیٹ ہیں۔"

"تم پارلر نہیں گئیں ثانی۔" امی اس کی تیاری کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"نہیں تو۔۔۔ کیوں ٹھیک سے تیار نہیں ہوئی؟"

"کتنا ہلکا میک اپ کیا ہے' مجھے بتا دیتیں میں صبح آ کر لے جاتی۔"

"اف امی۔۔۔ اتنے بھاری زیور اور کپڑوں کے ساتھ ٹھیک ہے میک اپ کیوں ابو صحیح ہے نا۔"

"ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے ہماری گڑیا تو بہت پیاری لگ رہی ہے۔"

"تم آج بھی لاپروائی کر گئیں۔"

"امی! اب ٹینشن نہ دیں پلیز۔۔۔ ورنہ مجھے فکر ہونے لگے گی۔"

"کیوں بچی کو پریشان کر رہی ہو۔ پیاری تو لگ رہی ہے۔ چلو بیٹا کچھ نہیں' کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ شاباش جلدی چلو' دیر ہو گئی ہے۔"

"ہاں اب کیا ہو سکتا ہے چلو۔۔۔ مگر۔۔۔ روم کچھ چھوٹا نہیں۔۔۔ فرنیچر ڈلوانے کے بعد جیسے سکڑ گیا ہو۔" وہ اب اس سے ہٹ کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"فلیٹ کے روم اور کتنے بڑے ہوتے ہیں امی۔۔۔" وہ بے زاری سے اٹھی' پتا تھا اب وہ ہر ایک چیز پر نظر ڈال کر تنقید کرنے لگیں گی۔

"گھٹن نہیں ہوتی تمہیں۔ ویسے تو بڑا واویلا مچاتی تھیں۔ تنگ کمرا نہیں چاہیے۔ کھڑکی بڑی ہو' زیادہ سامان نہیں ڈلوائیں میرے روم میں' کھلا کھلا پسند ہے۔ گھٹن ہوتی ہے۔" وہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں۔

"امی! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" وہ دیکھ رہی تھی ان کے ایسا کہنے سے مدثر بری طرح شرمندہ ہو رہا ہے۔

"چلو بھئی ان باتوں کے لیے زندگی پڑی ہے۔ چلو بیٹا ہم تو چلیں۔" وہ مدثر کی طرف آئے۔ اس کی گھبراہٹ انہوں نے بھی محسوس کی تھی۔

"بھئی تمہاری ساس بہت مشکل خاتون ہیں۔ ان سے کوئی اچھی امید مت رکھنا۔ البتہ جو کہتی رہیں چپ چاپ سنتے رہنا۔ ہم سے پوچھو کتنا مشکل وقت گزارا ہے۔" وہ آہستگی سے اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولے تو وہ مسکرا دیا۔

"کوئی پرابلم ہو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دینا۔ باپ کی طرح ہوں' بلکہ باپ ہی ہوں اب تو۔۔۔ کیوں؟"

"جی بہتر۔"

"مدثر۔۔۔ خوش ہو نا تم بیٹا؟" وہ اسے جانچتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"جی۔۔۔ بہت۔" اس کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔

"ثانیہ اچھی ہے۔ بس کبھی کبھار ضدی ہو جاتی ہے۔ مگر کیئرنگ بہت ہے۔ دیکھو وہ بڑے گھر سے آئی

ہے۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ ہو تو آرام سے سمجھا دینا۔ برامت ماننا اس کی کسی بات کا۔"

"جی۔"

"مدثر بیٹا! ایک بات یاد رکھو۔ سچائی اور محبت سے زیادہ اس دنیا میں کوئی چیز اتنی طاقت نہیں رکھتی پیسہ بھی آنی جانی چیز ہے۔ کل کو تم محنت کرو گے تو پیسہ بھی آجائے گا۔ تمہارا باپ بہت محنتی اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے تین، تین گھر چلائے ایک وقت میں۔ ماں، باپ کے گھر خرچا بھیجتا تھا۔ وہ گھر اپنے مین ٹین رکھتا تھا۔ بہت ڈسپلن تھا اس میں۔" وہ بڑی خاموشی سے باپ کی تعریفیں سنتا رہا۔

کیا کہتا کہ ڈسپلن کے چکر میں وہ پیسہ تو دیتا رہا سب کو، مگر اپنا آپ نہ دے سکا۔ اس کے ماں، باپ اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ اس کا سگا بیٹا ایک گھر میں رہتے ہوئے باپ کی محبت سے محروم رہا۔ اگر یہ خلا پر ہوتا رہتا تو آج مدثر احمد کی شخصیت میں اتنا بڑا خلا نہ پیدا ہوتا۔

☼ ☼ ☼

"ثانی! میں تمہاری اس شادی سے بہت ناخوش ہوں۔" وہ واپسی پر گھر لے آئے تھے اسے۔ مدثر نیچے احسان صاحب کے ساتھ تھا اور وہ امی کے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

"میں نے بھی یہ شادی خوش رہنے کے لیے نہیں کی ہے۔"

"تم کیسے رہو گی اس فلیٹ میں۔ مجھے تو سوچ سوچ کر گھٹن ہو رہی ہے۔"

"امی پلیز! اب آپ مجھے مزید ڈسٹرب نہ کریں ایسی باتیں کرکے۔"

"تمہارے باپ نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ وہ تو موقع کی تلاش میں تھا۔ میں تو چاہ رہی تھی ایک دفعہ پھر فہد سے بات کرلی جائے۔"

"کیا بات کرلی جائے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، تعجب سے انہیں دیکھتے ہوئے۔

"دیکھو اس نے مجبوری میں ایسا کیا۔"

"میں کسی مجبوری کو نہیں مانتی۔" اس نے بیچ میں ہی انہیں ٹوک دیا۔

"وہ معافی مانگ رہا تھا، واپس آنے کی بات کررہا تھا۔"

"امی! وہ آپ کا بھانجا ہے، مگر میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ میری حالت نہیں دیکھ رہیں اس کی طرف داری کررہی ہیں۔ اس کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ اسے نہیں کرنی تھی شادی۔ اگر اتنا ہی مرعوب تھا وہ اپنے چچا کی فیملی سے تو اس نے منگنی کیوں کی میرے ساتھ۔ مجبور تھا تو مجھے اتنے خواب دکھانے نہیں چاہیے تھے۔ میں اسے دھوکے کے علاوہ اور کیا کہوں گی۔"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو اس شخص سے تو بہتر وہی تھا۔ بھلے سیکنڈ میرج کرلیتا۔ ہوسکتا ہے وہ اسے چھوڑ دیتا تمہارے لیے۔"

"معذرت کے ساتھ امی۔ اسے اگر چھوڑنا ہوتا تو شادی ہی نہ کرتا۔"

"بیٹا! وہ بہت مجبور تھا۔ اس نے یہ سب اپنے فیوچر کو بہتر کرنے اور چچا سے باپ کا حصہ لینے کے لیے کیا ہے۔ اس کے سر پر باپ نہیں، اسے اپنے اور اپنی ماں کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ پھر وہ تمہارے لیے بہت پیسہ بنانا چاہ رہا تھا۔"

"مجھے پیسہ نہیں چاہیے تھا۔ اسے یہ پتا تھا۔ میں نے ابو کی خواہش پر ایک کنگلے آدمی سے شادی کرلی تو کیا اپنی پسند پر میں سمجھوتا نہ کرلی۔"

"بہرحال جو ہوا بہت غلط ہوا۔ میں تو تمہارے لیے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔ ثانی۔ تم اگر وہاں سیٹ نہ ہوسکو تو گھر آجانا۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

"امی۔ آپ اپنی بیٹی کے ولیمہ کے دن اس سے کہہ رہی ہیں کہ سیٹ نہ ہو تو گھر واپس آجانا؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔

"آپ کو تو چاہیے کہ مجھے حوصلہ دیں، سمجھائیں۔"

"میں تم پر جبر نہیں کرنا چاہتی۔ اس سب کے لیے تمہارا باپ کافی ہے۔"

"مگر واپس آنے کا مطلب تو سمجھتی ہیں نا آپ۔" اسے بہرحال بہت برا لگا تھا۔

"مجھے صرف تمہاری خوشی عزیز ہے۔"

"بہرحال آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ واقعی ڈسٹرب ہوگئی تھی۔

"اچھا چلو موڈ ٹھیک کرلو اپنا۔ باہر چلیں۔"

"نہیں امی۔ مجھے جانا ہے ابھی گھر۔"

"گھر۔ اب سے پہلے تو تمہارا یہی گھر تھا۔ کیا گھر گھر کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

وہ نیچے اتر کر سامان پیک کرنے لگی ہے۔

"اچھا ایک بات سنو۔ فہد تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ فکر مند ہے تمہارے لیے۔ اس سے ایک دفعہ بات کرلو بیٹا۔"

"امی! آئندہ آپ اس کا نام بھی نہیں لیں گی میرے سامنے۔ میں یہ چیپٹر بند کرچکی ہوں۔"

وہ ساری چیزیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج وہ اس کے نزدیک بیٹھا اس سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ احسان صاحب سے بہت بات چیت کرکے اس کے اندر کچھ اعتماد سا آگیا تھا اور وہ ذہنی طور پر مطمئن بھی ہوگیا تھا۔ جب ہی صوفے پر اس سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"ثانیہ۔" اس نے آہستگی سے اسے پکارا۔

وہ گم تھی اپنی سوچوں میں، جب اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور وہ چونک گئی۔ وہ اس کے اس طرح چونکنے پر عجیب احمق پن سے مسکرایا تھا۔

"انگوٹھی کیسی لگی۔"

"کون سی۔" وہ نا سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ خاصا فریش لگ رہا تھا۔

"جو میں نے دی تھی۔ پسند نہیں آئی کیا پہنی نہیں؟" وہ پہلی بار اعتماد سے بات کررہا تھا۔

"اچھی تھی۔ یاد نہیں رہا۔ پہن لوں گی۔" اس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ کھسکا لیا۔

"یہ انگوٹھی زیادہ اچھی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے بولا جو شہادت کی انگلی میں پہنی ہوئی تھی۔

یہ فہد والی انگوٹھی تھی، اس نے سوچا اس نے اتاری کیوں نہیں۔

"آپ ہر وقت اسے دیکھتی رہتی ہیں۔"

"اچھا۔" اسے حیرت سی ہوئی، یہ تو خود اس نے بھی نہیں نوٹ کیا تھا۔

"ہاں کسی دوست نے دی تھی گفٹ میں۔" وہ اب بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا یہ اس نے اپنی پسند سے لی تھی فہد کے ساتھ۔

"وہ آئی تھی شادی میں۔"

"کون؟"

"دوست آپ کی۔"

"نہیں۔ اس لیے کہ مجھ سے پہلے اس کی شادی ہوچکی ہے۔ باہر ہے وہ۔ آ نہیں سکتی تھی۔"

"اوہ اچھا۔ پھر بات چیت ہوتی ہے اس کے ساتھ۔" اسے بس بات کرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔

"نہیں ہوتی۔"

"کیوں ناراضی ہے۔"

"ہاں۔"

"صلح کرلینی چاہیے دوستوں سے۔"

"ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔

"دوستوں کی ضرورت نہیں؟" وہ خاصا حیران تھا۔

"ہاں۔ کسی کی بھی ضرورت نہیں۔"

اور وہ وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ کہنا چاہتا تھا۔ میری بھی نہیں؟ مگر کہہ نہ سکا۔ اس کے بعد وہ جب بھی اس سے بات کرنا چاہتا وہ بیزار ہو کر اٹھ جاتی۔ اسے بات کرنے کا ڈھنگ جو نہیں تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بے زار آجاتی تھی۔ بہت ٹائم لگا ان لوگوں کو سیٹ ہونے

میں، وہ اب اس کی بے زاری اور لاپروائی کا عادی ہو چکا تھا اور وہ اس کی حرکتوں اور باتوں کی۔ بہت مشکل سے ان کے درمیان یکسوئی پیدا ہوئی، تعلق بن پایا، مگر سب کچھ بے دلی سے۔ کوئی مطمئن نہیں تھا۔ مگر اس اچھی تبدیلی سے وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اسے ثانیہ سے محبت ہونے لگی تھی۔ وہ اس کا خیال بھی رکھنے لگا تھا۔ بس اسے دل ہی دل میں شکایت تھی کہ وہ اسے وہ اہمیت نہیں دیتی۔ وہ محبت نہیں دیتی کچھ مانگتی نہیں، کوئی فرمائش نہیں کرتی، حق نہیں جتاتی، احساس نہیں دلاتی، جیسے اسے اس کی ضرورت نہ ہو، جیسے وہ بس گزارا کر رہی ہو۔ یہ سب سچ تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے ثانیہ کی بہت ضرورت تھی۔ وہ اس کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جب میکے جاتی تو وہ لمحہ لمحہ گن گن کر گزارتا۔ مگر اسے اظہار کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ سب کچھ خود سمجھ جائے اور اس سے اسی طرح محبت کرنے لگے۔ جیسے وہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اگر محبت کرے گی تو پروا بھی کرے گی۔ وہ اظہار بھی کرے گی، اسے خوش بھی رکھے گی۔ اسے انتظار تھا کسی دن وہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسے بیویاں شوہروں کے ساتھ کرتی ہیں، وہی ناز نخرے، فرمائشیں، انتظار، کھانے پینے کا خیال رکھنا، وہ دفتر جائے تو فون کر کے پوچھنا، وہ ایسا کچھ نہیں کرتی تھی۔

وہ ہر دفعہ سوچ سوچ کر بجھ جاتا اور پریشان ہو جاتا۔ وہ تھک جاتا تھا۔ اس سے کہنا چاہتا پر کہتا نہیں تھا۔ وہ اسی بات پر خوش ہو جاتا کہ وہ کبھی کبھار ٹائم دیتی ہے۔ مختصر سی آمدنی میں گزارا کر رہی ہے۔

وہ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا، پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ کبھی پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم کیوں ناخوش ہو۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ تاکہ میں دور کرنے کی کوشش کروں۔ مگر نجانے کیوں وہ ہر بار کہتے کہتے رک جاتا۔ بات بدل جاتی۔ وہ ہر بار گھر کے لیے چند ضروریات لکھ کر لسٹ پکڑا دیتی تھی اور اپنے لیے کچھ نہ منگواتی، یا کبھی بے زاری سے اسے جھڑک دیتی۔

وہ چپ ہو جاتا۔ سارا اعتماد رفوچکر ہو جاتا۔ احساس کمتری اور بڑھ جاتا۔ مگر ایسے میں بھی ایک محبت کا احساس تھا جو اسے کسی قدر خوش رکھے ہوئے تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگا تھا اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼
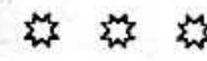
وہ بہت دنوں سے بیمار تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ میکے چلی گئی اور وہیں سے اسے کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ وہ امید سے ہے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ فوراً گیا اور اصرار کر کے اسے گھر لے آیا تھا۔ پہلی بار اس نے پیار سے اصرار کیا تھا۔ اس لیے وہ چلی آئی۔ وہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا مگر پھر بھی کہاں لاپروائی ہوئی تھی کہ کچھ غلط ہو گیا۔ اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ وہ بہت دن بیمار رہی، پھر ماں آ کر لے گئی تھی۔ وہ روز فون کرتا۔ کوئی دسویں بیل پر جا کر وہ اس کا فون اٹھاتی تو بے زاری اس کے لہجے سے جھلک رہی ہوتی۔ وہ گھر گیا اس سے ملنے کے لیے اور اس کے بجائے اس کی ماں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ احسان صاحب گھر پر نہیں تھے۔ ورنہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مگر آج اس کی ساس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور پوری کسر نکال دی تھی۔

وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا رہا تھا اور اس کے کھاتے میں کردہ ناکردہ گناہ درج کر دیے گئے تھے۔ اس کی ماں نے صاف صاف کہا کہ وہ اب گھر نہیں لوٹے گی۔ وہ بھول جائے کہ ثانیہ سے اس کا کوئی رشتہ بھی ہے، بلکہ انہوں نے تو علیحدگی تک کی بات کر دی اور وہ سن ہو گیا۔ اس نے بہت چاہا کہ اس سے مل لے۔ یہ ساری باتیں خود اس سے سن لے، تاکہ یقین آ جائے مگر اس کی ماں کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکا۔ نہ اسے بولنے اور صفائی دینے کا موقع دیا گیا۔ وہ مجرم بن کر لوٹ آیا۔ احسان صاحب سے بات کی۔ وہ خود حیران ہو گئے اسے تسلی دی کہ گھر جا کر ثانیہ سے بات کریں گے اور پھر ثانیہ کو خود گھر چھوڑ آئیں گے۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم ماں، بیٹی نے۔ کوئی طریقہ ہوتا ہے بات چیت کا۔ مدثر آیا تھا کس طرح بات کی ہے تم لوگوں نے۔"

"وہ آیا تھا؟" ثانیہ کچھ حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ "آپ نے بتایا نہیں امی؟"

"تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔ بچے میں نے بات کر لی تھی اس سے۔"

"اور بات کیا کی یہ بھی بتا دیں۔" وہ تھک کر کرسی پر آ بیٹھے۔

"یہی کہ ثانیہ اب اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"مگر کیوں... ثانی یہ تم نے کہا تھا۔" وہ اس سے سننا چاہ رہے تھے۔

"اوہ... مجھے کچھ ٹائم چاہیے۔ میں نے یہ کہا تھا، میں فی الحال نہیں جا رہی۔"

"اور تمہاری ماں نے تو علیحدگی تک کی بات کر لی۔"

"کیوں امی... آپ نے ایسا کیوں کہا۔" وہ قدرے حیران تھی۔

"تم نے جو کہا تھا کہ اس کٹھ پتلی کے ساتھ رہ رہ کر بے زار آ گئی ہوں۔ مجھے نہیں جانا اس گھر میں۔"

"کہا تھا، پر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ اب شادی کی ہے تو جانا پڑے گا۔ مگر فی الحال نہیں جانا چاہتی میں۔"

"بہتر تھا کہ تم مدثر کو ثانیہ سے ملنے دیتیں رخسانہ! خود اپنی جانب سے کیا کچھ کہہ دیا۔ بچہ ساری رات پریشانی میں سو نہ سکا۔"

"دوسروں کے بچوں کی بہت فکریں ہیں آپ کو، اپنی بچی کی کوئی فکر نہیں ہے، جس کی اٹھا کر زندگی برباد کر دی آپ نے۔"

"تم خوش نہیں ہو ثانی!" وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"میں ٹھیک ہوں ابو۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"جھوٹ بول رہی ہے، یہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہوں اس کے ساتھ۔"

"ثانی کوئی شکایت ہے تو بیٹا شیئر کرو ابو سے۔ مجھ سے کیوں نہیں کہتیں۔"

"ابو... بس وہ ذرا مشکل آدمی ہے۔ اس کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ وہ عجیب سا آدمی ہے۔"

"بیٹا وہ اکیلا رہا ہے۔ ماں، باپ کے بغیر۔ چھوٹی عمر میں اس نے بڑے صدمے سہے ہیں۔ وہ سہما ہوا ہے اسے محبت دو، اپنائیت کا احساس دلاؤ۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ابو... میں نے بہت کوشش کی ہے... مگر... بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ میں کچھ وقت اکیلے رہوں سکون کے ساتھ۔ آپ پلیز مجھے ذرا موقع دے دیں۔ میں علیحدگی کی بات نہیں کر رہی، مگر دیکھیں میں کچھ عرصہ غور کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس دوران اگر کچھ بگڑ گیا تو۔" وہ ڈرے ہوئے تھے۔

"ابو! میں بگڑی ہوئی ہوں۔ بکھری ہوئی ہوں۔ فی الحال مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ تھوڑا ریلیف دے دیں۔"

"بیٹا تم اس سے بات تو کر لو۔ کہہ دو بعد میں آ جاؤ گی۔ ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا شوہر ہے وہ۔"

"اوکے... میں دیکھتی ہوں، مگر پلیز آپ فی الحال مجھے فورس نہ کریں۔"

"اوکے بچے... مگر دھیان سے... دیکھو گھر روز روز نہیں بنتے بچے۔ پھر وہ بے چارہ ڈرا ہوا ہے۔ تمہاری بہت پروا ہے اسے۔ بغیر ماں، باپ کے بچہ ہے۔ اس کے ساتھ اتنی سختی نہ برتا کرو۔"

"احسان صاحب! ہم نے کوئی محبت اور قربانی کا خیراتی ہاؤس نہیں کھول رکھا ہوا کہ ہر کسی کو خیرات میں قربانیاں دیتے پھریں۔ آپ کو اپنی بچی کی کوئی پروا نہیں ہے، حد ہے۔"

"وہ کوئی اور نہیں تمہارا داماد اور اس کا شوہر ہے رخسانہ بیگم!"

"ہاں شوہر بھی آپ نے سر پر سوار کیا ہے اس کے۔ میں تو شروع سے خلاف تھی اس شادی کے۔"

"امی پلیز بس کردیں۔"

"ثانی کیا واقعی میں نے زیادتی کردی بچے۔"

"پتا نہیں ابو۔۔۔ مگر آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں بس اتنا سمجھتی ہوں اگر میں ابھی وہاں گئی تو مزید باغی ہو کر آجاؤں گی۔ اس لیے فی الحال میں ٹھنڈے دماغ سے کچھ سوچنا چاہتی ہوں اور بات کروں گی ایک دو دن میں' آپ فکر نہ کریں۔ ابھی اگر بات ہوئی تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے جیسے تم ٹھیک سمجھو۔ میں فی الحال اسے منع کردیتا ہوں کہ وہ تمہیں تنگ نہ کرے۔" وہ بہت مایوس ہو کر اٹھے تھے وہاں سے۔

ثانیہ خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے' بس دل بوجھل سا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ نہیں رہ پائے گی اس کے ساتھ اور فہد کو بھلا نہیں پائے گی شاید۔۔۔ دو چیزیں آپس میں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھی' اس لیے اس سے کوئی ایسی ویسی بات کرکے اسے بھی مزید پریشان کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

احسان صاحب نے اسے سہولت سے سمجھا دیا کہ کال مت کرے اور وہ ۔ لمحہ لمحہ انتظار کرتا رہا کہ وہ کال کرے گی' مگر اس نے ایک دن بھی بھولے سے خبر نہ لی اس کی' اس نے خود ہی ایک دن فون کھڑکایا۔ ایک' دو' تین" چار' چھ بیل ہوئیں۔ وہ پھر فون ملانے لگا تو دوسری بیل پر ریسیو کرلیا گیا۔ اس نے فون بھی کسی اور نمبر سے کیا تھا' تاکہ وہ اس کا نمبر دیکھ کر بند نہ کرے۔

"ہیلو جی' فرمائیں۔" یہ وہی آواز تھی۔ اس کی ثانی کی۔

"ہیلو۔۔۔" وہ مشکل سے بول سکا۔

"جی بولیں' کون؟ کس سے بات کرنی ہے؟"

"ثانیہ سے۔۔۔" وہ بمشکل کہہ پایا۔

"جی بول رہی ہوں' مگر آپ کون ہیں۔" کمال ہے وہ اس کی آواز نہیں پہچان رہی تھی۔ اس کی بیوی پورے نو ماہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کی آواز سنی۔ اس سے بات کی۔

"مدثر بول رہا ہوں ثانیہ!" اس کے گلے سے آواز تھکی ہوئی نکلی۔

"اوہ۔۔۔ مدثر۔۔۔ کیا حال ہیں آپ کے۔" اس کا اتنا اجنبی لہجہ کیوں تھا۔

"تم کیسی ہو؟" اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"ٹھیک ہوں۔"

"طبیعت ٹھیک ہے۔" فکر مندی سی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔"

"میں ملنے آجاؤں؟" بے تابی جھلکی۔

"فی الحال نہیں پلیز۔۔۔"

"کب آؤ گی۔"

"پتا نہیں۔" رکھائی سے کہا گیا۔

"ثانی۔۔۔" آخری فقرہ ٹوٹ گیا۔ "میں کال نہیں کروں گا اب۔" آنسو لفظوں میں آگئے تھے۔

ادھر سے لائن ساکت تھی۔ الوداعیہ کلمات بھی نہیں' نہ کوئی معذرت۔۔۔ نہ کوئی دعا۔۔۔ نہ کوئی درخواست۔۔۔ نہ بات۔ بس سلسلہ ختم۔۔۔ اس دن ثانیہ خود اپنے سفاک طرز عمل پر افسردہ تھی۔

مگر وہ صرف افسردہ تھی' جبکہ مدثر احمد بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس دن کے بعد واقعی اس نے کبھی فون نہیں کیا۔ ان کی بات نہیں ہوئی پورے چھ ماہ بیت گئے۔ ان کی شادی کی سالگرہ گزر گئی۔ جیسے سب کچھ راکھ کا ڈھیر بنتا جا رہا تھا۔ خود مدثر احمد بھی اور اندر سے ثانیہ بھی۔ مگر وہ پچھلے سات ماہ سے خود کو بھی سزا دے رہی تھی اور اسے بھی۔۔۔ یہ سزا بہت لمبی ہوگئی تھی' عنقریب جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ ساڑھے آٹھ ماہ ثانیہ کے تو ہوا بن کر اڑے تھے

مگر مدثر احمد پر بجلی بن کر برسے اور پہاڑ بن کر ٹوٹے تھے۔

ثانیہ کو دو ماہ بعد ہی جاب مل گئی تھی۔ وہ پورے چھ ماہ اپنی جاب' اپنے کام میں مگن رہی' پوری طرح سے جیسے بھول گئی یا بھولنے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کا کوئی گھر تھا' کوئی شوہر بھی تھا' کوئی نکاح کے کاغذات پر معاہدہ کیا تھا۔۔۔ اس کا مقصد تو یہی تھا کہ جاب کرکے اپنا کچھ بنالے تو پھر چلی جائے گی۔ اس پر بار نہیں ہوگی' اپنا خرچا خود اٹھائے گی۔ اس نے یہ نو ماہ جس تنگی سے گزارے تھے' اسے ہی پتا تھا۔ وہ اس پر اضافی خرچا ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی ہمدرد بھی تھی۔ بس ایک غلطی اس سے ہوگئی کہ جو معاہدہ کیا اس پر پوری نہ اتر سکی۔ اس سے تعلق ہی ختم کردیا۔ رابطہ ہی توڑ دیا۔ اتنی سفاکی' اتنی بے رحمی پر اسے کبھی کبھار دکھ ہوتا تھا مگر عجیب مرحلہ تھا کہ ہر معاملے میں خود کو بے بس پاتا تھا۔

ابھی بھی تو وہ بے بس ہوگئی تھی جب احسان صاحب نے ناشتے پر افسوس کے ساتھ اس کا حال سنایا تھا۔

"مدثر کو چار ماہ پہلے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔"

"مگر کیوں۔" وہ چونک گئی تھی۔

"وہ ٹھیک کام نہیں کرپا رہا تھا۔"

"یہ شخص کسی قابل نہیں ہے۔" اس کی ماں کا فرمان تھا۔

"وہ ذہنی دباؤ کے سبب کام سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ پچھلے چار ماہ سے اس کی عجیب حالت ہے۔ کل گیا تھا اس کی خیریت پوچھنے۔"

"آپ کو کیا ضرورت تھی جانے کی وہاں۔" رخسانہ بیگم برہم ہوئیں۔

"ابو۔۔۔ وہ کیسا ہے۔" اس نے ناشتا چھوڑ دیا تھا۔

"اسے اس حالت میں کیسا ہونا چاہیے۔ جب اس کا کوئی نہیں۔ کاش میں اس کی شادی کسی مڈل کلاس فیملی کی لڑکی سے ہی کرادیتا۔ وہ اسے چھوڑ کر تو نہ جاتی۔۔۔ وہ بھی خوش رہتا۔۔۔ تمہارے ساتھ بھی زیادتی نہ ہوتی۔" انہوں نے چائے کا ادھورا کپ چھوڑ دیا تھا۔

"زیادتی تو آپ نے خوب کی۔۔۔ مگر اپنی بیٹی کا نہیں' پھر بھی اسی کا افسوس کھائے جا رہا ہے آپ کو۔" وہ کیوں خاموش رہتیں بھلا۔

"ابو ٹھہریں۔۔۔ میں چلتی ہوں۔۔۔ مجھے وہاں ڈراپ کردیجیے گا۔"

"کہاں۔۔۔ تم پاگل ہوگیا ثانی! کہاں جا رہی ہو۔" وہ تیز ہوئیں۔

"وہ بہت برا سہی۔۔۔ مگر وہ شوہر ہے میرا۔ اس حال میں تو مجھے جانا چاہیے' اس کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔"

"ثانی! تم اپنا فیصلہ آٹھ ماہ بعد بدل رہی ہو۔ پھر پچھتاؤ گی' مت جاؤ' پھنس جاؤ گی وہاں جاکر۔"

"مجھے جانا چاہیے امی۔۔۔ ابو آپ ٹھہریں' میں ذرا بیگ اور سیل فون وغیرہ لے آؤں۔

میں اپنی گاڑی میں جاتی ہوں۔ ہوسکتا ہے مجھے وہاں رکنا پڑ جائے کچھ دیر۔" وہ نیچے آکر ان سے پوچھنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے' مجھے ویسے بھی دفتر سے دیر ہوجائے گی' تم اپنی گاڑی میں چلی جاؤ۔ میں فون کرکے تم سے پوچھ لوں گا پھر۔"

"اوکے' بہتر ہے۔" وہ ان کے ساتھ باہر نکلی۔

"ثانی شام سے پہلے لوٹ آنا۔"

وہ فکر مندی سے کہتے ہوئے بیٹھ گئیں سر پکڑ کر۔ وہ تیزی سے گاڑی گیراج سے نکالنے لگی اور وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔

"اللہ کرے اب تم اپنے فیصلے پر قائم رہو۔" انہوں نے دل میں دعا کی تھی اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے ثانیہ کی گاڑی تھی۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر مڑ کر میں سے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اندر آئی تو گھر کی عجیب حالت تھی۔ ہر جگہ چیزیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بکھری ہوئی تھیں۔ اور کمرے تک آکر وہ ٹھٹک گئی بیڈ کے پاس وہ اوندھے منہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بھی نکلا ہوا تھا۔

وہ دہل گئی۔۔۔ اسے جھنجوڑا آوازیں دیں۔ مگر وہ شاید بے ہوش تھا۔ سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ خون فرش پر سوکھ بھی چکا تھا۔ گویا وہ رات سے یا کافی دیر پہلے سے گرا ہوا تھا۔

اس نے عجلت میں باہر نکلتے ہوئے پڑوسیوں کو آواز دی۔ ایک' دو آدمی باہر آئے' ان کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈالا۔ وہ دونوں آدمی اس کے ساتھ تھے۔ ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ پیچھے مدثر کا سر گود میں لیے بیٹھی تھی اور اسی ٹائم ابو کو کال ملائی۔

"ابو۔۔۔ ابو' مدثر بے ہوش تھا' میں اسے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہاسپٹل لے جا رہی ہوں' آپ پلیز وہاں آجائیں۔"

وہ بس اتنا کہہ سکی تھی' اس کا سر تھامے اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ آنسو بے اختیار ہو کر امڈ آئے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا خود پر بھی کہ وہ وہی تھی جو آٹھ ماہ اس سے دور رہی تھی۔ اس کی خبر بھی نہ لی اور اب اتنے عرصے بعد وہ اس کی حالت پر یوں سب کے سامنے رو رہی تھی۔ ان کے اسپتال پہنچتے ہی احسان صاحب بھی پہنچ گئے تھے۔ اسے فوراً" ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔ وہ ویٹنگ لاؤنج میں پریشان بیٹھی تھی۔ شام تک اسے ہوش آگیا تھا۔ وہ احسان صاحب کے ساتھ اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے دماغ پر اثر تو ہوا تھا کچھ' مگر وہ جسمانی طور پر ٹھیک تھا۔ زخم پر پٹی کر کے دوا دے دی گئی۔ ڈاکٹر نے انہیں کسی دماغی اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔ مگر وہ ضد کر کے اسے گھر لے آئی تھی۔ احسان صاحب کو اس کے پاس بٹھا کر وہ گھر گئی اور اپنی ساری چیزیں' کپڑے سمیٹ کر گھر لے آئی' جب تک وہ مدثر کے پاس بیٹھے رہے۔ اس نے اپنی نگرانی میں گھر سے جو ملازم لائی تھی اس سے ساری صفائی کروائی اور میلے کپڑے لانڈری بھجوائے۔ اس کے لیے کھانا بنا کر وہ اندر آئی تو وہ کچھ حواسوں میں تھا۔ احسان صاحب نے زبردستی اسے کھانا کھلایا۔ خود ثانیہ کے ساتھ کھایا تھا اور رات گئے وہ گھر لوٹے اسے پوری طرح سے سیٹ کر کے۔ گھر آتے ہی رخسانہ بیگم ان پر برس پڑی تھیں' مگر وہ کتنے دنوں بعد آج چین کی نیند سوئے تھے۔ تھکن بھی تھی اور طمانیت بھی۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ دن چھٹی لے لی تھی۔ پھر وہ جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہو گیا اور کچھ ذہنی طور پر تو وہ وہیں سے جاب پر جانے لگی۔

وہ پوری کی پوری بدل چکی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ کچھ نارمل تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے کھو جاتا تھا۔ کبھی کبھار عجیب حرکتیں کرنے لگ جاتا۔ بیٹھے بیٹھے گلاس اٹھا کر پٹخ دیتا۔ فرش پر ڈرے ڈرے سے انداز میں بیٹھ جاتا۔

کبھی سخت گرمی میں جیکٹ پہن لیتا اور کہتا مجھے سردی لگ رہی ہے۔

اور کبھی سردی آتی تو بنیان میں پھرتا تھا۔ وہ لاکھ کہتی' مگر کچھ نہیں پہنتا۔ پہلے کی نسبت گزارا اب مشکل تھا' بلکہ ناممکن تھا' مگر وہ چاہ رہی تھی تو کر رہی تھی۔

شام کا وقت تھا جب وہ گھر آئی راشن لے کر تو دروازہ اندر سے بند تھا' اس نے بہت بیل دی' کھٹکھٹایا' مگر نہیں کھلا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی پوری' اس نے ایک پائپ کا سہارا لے کر پہلے سارا سامان اندر پھینکا' پھر کوشش کر کے خود کھڑکی سے کود کر اندر آئی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ سامان پھینکنے کے سبب بری طرح بکھر گیا تھا۔ سیب تھیلے سے نکل کر فٹ بال کی طرح کوئی بیڈ کے نیچے' کوئی کرسی کے نیچے' کوئی دروازے کے کونے سے آلگا۔ یہی حال دیگر چیزوں کا تھا۔ مگر سب کچھ سمیٹنے سے پہلے وہ۔۔۔ اسے دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہ رہی تھی کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ کچن کے قریب ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کرسی پر گم صم بیٹھا تھا۔

"مدثر۔۔۔ ٹھیک ہو نا۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ سردی نہیں لگ رہی ؟" وہ بنیان اور ٹراؤزر میں گم صم بیٹھا تھا۔ اسے دیکھنے لگا' مگر بولا کچھ نہیں۔

"مسودی! طبیعت ٹھیک ہے نا۔" اس نے اپنے دوپٹے سے اس کے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔ اتنی سردی میں بھی اسے پسینہ آرہا تھا۔

وہ بچوں کی طرح غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگا۔

"مدثر! کیا ہوا۔ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔" آج تیسرا مہینہ تھا' مگر اس کی ذہنی حالت ویسی کی ویسی تھی۔ کبھی کبھار وہ یوں ہی غائب دماغ ہو جاتا جیسے اسے پہچان نہیں پا رہا ہو یا کچھ کہنے کی کوشش تو کر رہا ہو مگر کہہ نہیں پا رہا ہو۔

"مدثر بولو نا۔۔۔ کچھ تو بولو۔۔۔ اچھا کچھ کھایا ہے۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

پچھلے تین ماہ سے وہ اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی' یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ ایک بچے کے ساتھ پوری ذمہ داری کے ساتھ رہ رہی تھی۔ نیند میں اٹھ اٹھ کر اسے دیکھنا کہ کہیں وہ کمرے سے باہر تو نہیں نکل گیا۔ کہیں وہ باہر جاتے ہوئے گر تو نہیں گیا۔ اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ خون تو نہیں بہہ رہا' درد تو نہیں ہو رہا۔

کبھی کبھار وہ نیند میں چیخنے لگتا اور وہ اسے بچوں کی طرح بہلاتی۔ بے بسی اتنی کہ وہ خود اس کے ساتھ رو پڑتی۔ اسے سنبھالتے سنبھالتے وہ خود آدھی پاگل تو ہو گئی تھی۔ کتنے ڈاکٹروں کے چکر لگا آئی۔ آج بھی وہ اسے اپنے ساتھ نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس کا مشورہ تھا کہ اسے مینٹل اسپتال داخل کرایا جائے' مگر اس نے کوئی اور حل چاہا تو یہی کہا کہ جگہ تبدیل کریں۔ اسے بہت سارے لوگوں کے ساتھ بٹھائیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو دیکھ کر بات کر کے مل کر کچھ بہتر ہو۔ وہ اس کا اور اپنا سامان پیک کر کے اسے اپنے گھر لے آئی کہ اسے احسان صاحب وقت دیں گے۔ جگہ بدلے گی۔ ملازم ہوں گے' ہو سکتا ہے اس کے اندر بہتری آہی جائے۔ مگر اسے کیا پتا کہ یہ سودا اور بھی مہنگا پڑے گا۔ وہ اسے لے تو آئی' مگر پھر بہت پچھتائی۔

اس کی غیر موجودگی میں اس کی ماں اس آدھے پاگل کے ساتھ عجیب عجیب باتیں کر کے اور اسے برا بھلا کہہ کر اسے اور ذہنی مسائل میں الجھانے لگی۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ فہد پاکستان آگیا ان کے گھر۔ اس نے تو ایک منٹ رک کر اس سے بات تک نہ کی تھی۔ مگر رزلٹ بہت جلد سامنے آیا۔ ایک دن مدثر نے کوئی چیز توڑ دی گھر کی' چیخنے لگا اور اس کی ماں اور فہد اسے پکڑ کر مینٹل اسپتال لے آئے۔ وہ جب گھر پہنچی رات کو تو اسے نہ پا کر پاگل سی ہو گئی تھی۔ پھر یہ پتا چلا کہ وہ اسے پاگل خانے چھوڑ کر آئے ہیں تو دماغ گھوم گیا۔ وہ ساری رات ان سے لڑتی رہی' روتی رہی اور صبح سویرے پاگل خانے پہنچی تو وہ اپنے آپے میں ہی نہیں تھا۔ گویا کہ اس کے علاوہ اب کوئی اور حل نہ تھا۔ وہ تھک کر گھر آئی تو ایک اور جنگ چھڑ گئی' اس کی ماں اور فہد کا نیا پلان۔۔۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

دو دن تک اسے ذہنی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ مدثر کا بہتر ہونا بہت مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن کے قریب ہے اور کوئی امید بھی نہیں ہے۔ مگر وہ اسے اکیلے چھوڑ کر نئی زندگی کیسے شروع کر سکتی تھی۔ پہلے یہ سب آسان تھا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب وہ محتاج تھا' اکیلا تھا' ایک پاگل آدمی کو اس حالت میں چھوڑ کر اس سے طلاق لے کر اپنا الگ گھر بسانا بہت مشکل' بلکہ ناممکن تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کے پیچھے ضرور گئی تھی' مگر اسے روکنے نہیں۔ انگوٹھی واپس کرنے اس کے بعد وہ رکا ضرور تھا۔ ان کے درمیان بات ضرور ہوئی تھی' مگر وہ اپنی طرف سے صفائیاں دے رہا تھا اور معافی مانگ رہا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں نم ضرور ہوئی تھیں۔ ایک بار سوچا اسے روک لے' مگر دل نے ساتھ نہیں دیا' اب باری ثانیہ کی تھی' اسے نبھانا تھا۔ کسی کی زندگی پوری کی

پوری اس پر انحصار کررہی تھی اور اسے اپنی تمام خوشیاں اس پر قربان کردینی تھیں۔ فہد جب گاڑی میں بیٹھا اور جب وہ اسے اللہ حافظ کہہ کر واپس آرہی تھی' اس کی چال میں عجیب مضبوطی تھی اور رخسانہ بیگم جنہوں نے کچھ دیر پہلے سکون کا سانس لیا تھا' وہ حیرانی سے اسے دیکھے گئیں۔

اور ثانیہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف سیڑھیاں چڑھ گئی اس نے بال سمیٹنے تھے' کپڑے تبدیل کرنے تھے۔ ناشتا کرنا تھا اور پھر خود کو مضبوط کرکے اس سے ملنے جانا تھا اور اب کی بار رونا بھی نہیں تھا۔ آنسوؤں کو چھپالینا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے اندر صبر سا آرہا تھا۔ اصل مقصد تو اس کا اب شروع ہوا تھا اور آج سے اس کی ڈیوٹی کا پہلا دن تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ زندگی کا ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ وہ دل پر جبر کرکے اس سے ملنے جاتی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہر بار دل ڈوب جاتا تھا' وہ پہلے پہل اسی طرح اسے دیکھ کر چیخنے لگتا تھا۔ پھر کچھ دن بعد اس نے چپ سادھ لی' کبھی کبھار اشتعال میں آکر اسے کچھ دے مارتا۔ ایک بار اسے دیکھ کر منہ چھپالیا۔ وہ ڈاکٹرز سے ملنے' مشورے کرنے لگی' اس دوران اس نے کئی نفسیات کی کتابیں پڑھ ڈالیں' کئی نفسیاتی معالجوں سے ملی تھی۔ اسے ہینڈل کرنے کے طریقے سیکھے' پھر اسے اپنے طور پر ہینڈل کرنے لگی۔

وہ اسے اب کلینک میں ملتی تھی۔ ڈاکٹر روم میں اسے لے آتے۔ وہ باتیں کرتی رہتی۔ وہ غائب دماغی سے سنتا رہتا۔ کچھ نہیں کہتا اور کبھی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا۔ ہر بار اپنی شکست پر دل ٹوٹ جاتا' ڈوب جاتا۔۔۔ مگر ہر دوسرے دن وہ اک نیا حوصلہ جمع کرتی۔ خود کو جوڑتی اور اس سے ملنے جاتی۔ وہ اب اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھی۔ اس سے باتیں کرتی۔

"مدثر! تمہیں یاد ہے تم ایک دفعہ میرے لیے گجرے لائے تھے۔"

"تمہیں یاد ہے میری ڈیٹ آف برتھ پر تم رات بارہ بجے کیک لائے تھے اور میں سو رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے نا مدثر۔" وہ نوالہ اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہنے لگی۔ وہ برا سا منہ بنا کر نوالہ چبانے لگا۔

"تم چلی گئی تھیں نا۔" اس نے بہت دیر بعد سوچنے کے بعد کہا تھا۔

"تم نے مجھے یاد کیا تھا؟" اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا' جس میں اس کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔

اس نے غائب دماغی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تم نے مجھے کال کی تھی۔"

وہ پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"اچھا میں نے نا۔۔۔ فرنیچر کی سیٹنگ چینج کی ہے۔" وہ اس کے منہ میں دوسرا نوالہ ڈالنے لگی' جب اس نے ہاتھ روک دیا۔

"کیا ہوا پیٹ بھر گیا؟"

"یہ تم کھالو۔" وہ بچوں کی طرح بولا۔

وہ خود کھا کر مسکرانے لگی۔ "تم بہت اچھے ہو' کیا میں بھی اچھی ہوں۔" اس نے بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"پھر تم مجھے میرے گھر لے جاؤ گی۔"

"ہاں تم ٹھیک ہو جاؤ تو میں تمہیں گھر لے جاؤں گی۔"

"وہاں نہیں لے جانا۔"

"وہاں کہاں؟"

"وہ جہاں سب ڈانٹتے ہیں۔ وہ تمہارا گھر ہے نا۔"

"ہم اب وہاں نہیں جائیں گے مدثر۔۔۔ ہم اب اپنے گھر جائیں گے۔"

"تم بھی چلو گی کیا؟"

"ہاں۔۔۔ ہم دونوں چلیں گے۔" وہ ٹفن بند کرنے لگی۔

"کب چلیں گے۔"

"جلدی چلیں گے۔" وہ اسے دوا دینے لگی۔

"مجھے نہیں کھانی یہ گولی۔ کڑوی ہوتی ہے۔ یہ زہر ہے نا۔"

"نہیں مدثر! یہ زہر نہیں ہے' یہ دوائی ہے' اسے کھا کر تم ٹھیک ہو جاؤ گے' پھر میں تمہیں گھر لے جاؤں گی۔"

"تم ثانیہ ہو نا۔" وہ گولی نگلتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں ثانیہ ہوں۔ کیوں تم مجھے نہیں پہچانتے؟"

"پہچانتا ہوں۔"

"پھر بتاؤ ثانیہ کون ہے؟"

"میرے گھر میں رہتی تھی' پھر چلی گئی۔"

"پھر لوٹ بھی تو آئی تھی نا مدثر!"

"نہیں آئی' فون نہیں اٹھاتی تھی۔ بہت بری تھی۔" وہ تھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں دوائی کے زیر اثر اب بند ہو رہی تھیں۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ وہیں بیڈ پر لیٹ گیا۔

اس کے سوتے ہی وہ ڈاکٹر کے پاس آ گئی۔

"اس کے ذہن پر آپ کے چلے جانے والا صدمہ ابھی تک ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔"

"مگر یہ اب بہتر ہونے لگے ہیں۔ انہیں سب یاد آ رہا ہے۔ یہ کبھی نیند میں آپ کو آواز دیتے ہیں۔"

"مجھے اس دن کا انتظار ہے ڈاکٹر صاحب! جب میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی اور وہ بالکل نارمل ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ مس ثانیہ! وہ دن ضرور آئے گا۔ آپ بہت محنت کر رہی ہیں۔ آپ کے صبر کا پھل میٹھا ہی ہو گا۔ آپ کو پتا ہے یہاں بہت سے مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اس لیے گھر نہیں جاتے کہ ان کے گھر والے ان سے تعاون نہیں کرتے۔ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے انہیں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ مسٹر مدثر کی صحت یابی میں اسی فیصد آپ کا ہاتھ ہے' باقی علاج کا۔"

"اس کے پاگل ہونے میں بھی اسی فیصد میرا ہی ہاتھ تھا' بیس فیصد تو وہ پہلے تھا' باقی کی کسر میں نے پوری کر دی تھی۔"

"مگر آپ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری امید ہیں مس ثانیہ۔"

"اور یہ امید میری زندگی کی آخری امید ہے ڈاکٹر صاحب!" وہ کوریڈور سے گزرتے ہوئے جا رہی تھی گیٹ کے پاس۔ جب مدثر بستر پر گہری نیند سو رہا تھا اور اس نے تب تک گہری نیند نہیں سونا تھا جب تک مدثر کو مکمل طور پر بے داری نہیں مل جانی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساڑھے پانچ سال بعد۔۔۔۔

مشکل وقت بہت مشکل سے گزرتا ہے' مگر اس کی ایک اچھی بات ہے' گزر جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ سال بہت مشکل تھے مگر گزر گئے تھے۔

صبح نے ہر چیز کو روشن کر رکھا تھا۔ جب وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی اور مدثر کی پکار پر اٹھی تھی۔ وہ جب منہ دھو کر باہر آئی تو وہ ٹیبل پر ناشتا لگا چکا تھا۔ سیب' پھل' جوس' چائے' بریڈ اور محسن کے لیے دلیہ تیار تھا۔

"مدثر۔۔۔۔ مجھے کیوں نہیں اٹھایا' بری بات ہے۔"

"تم رات بہت دیر سے سوئی تھیں ثانی۔۔۔ اچھا اب جلدی آؤ ناشتا کر لو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور ہاں اپنے بیٹے کو خود آ کر کھلاؤ' یہ میرے ہاتھ سے نہیں کھاتا۔" وہ محسن کو اس کی گود میں تھماتے ہوئے بولا۔

وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اسے بھی کھلانے لگی خود بھی کھانے لگی۔ مدثر ہر چیز نکال کر اسے دے رہا تھا اور کھانے کا اصرار کر رہا تھا۔ کبھی وہ اسے کھلانے میں مگن ہوتی' تو وہ خود نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتا۔

"توبہ مدثر! بچی تھوڑی ہوں میں' کھا لوں گی۔" وہ ہنس دیتی۔

وہ دونوں ایک دفتر میں جاب کرتے تھے جہاں احسان صاحب ہوا کرتے تھے۔ شام کو واپسی پر تقریباً ایک چکر وہاں کا لگتا تھا اور گھر آتے آتے مغرب ہو جاتی۔

آج اتوار کا دن تھا اور دن بھی بڑا نکھرا ہوا تھا' بلکہ نکھری ہوئی شام تھی' جب احسان صاحب اپنے نواسے کے ساتھ لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔

اور وہ گلاس وال کے پاس کھڑا مسکراتے ہوئے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو مدثر!" وہ اس کے پاس آئی اور اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"محسن کو دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو وہ بالکل ٹھیک بال پکڑ رہا ہے' وہ کھیل کو سمجھ رہا ہے' وہ کتنی تیزی سے دوڑ بھی رہا ہے۔"

"ہاں تو ماشاء اللہ ڈھائی سال کا ہو گیا ہے۔" وہ مسکرائی اس کی بات پر۔

"ہاں۔۔۔ مگر دیکھو اس میں کوئی کمی نہیں ہے نا۔ قوت مدافعت ٹھیک ہے' ذہن بھی ٹھیک ہے نا۔ میں رات کو اٹھ کر اسے بار بار دیکھتا ہوں' کہیں وہ چیخیں تو نہیں مار رہا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کی پیدائش سے پہلے کہا تھا کہ ان کی ذہنی حالت کا اثر بچے پر پڑ سکتا ہے۔

صرف ماں نہیں باپ کی فطرت اور ذہنی حالت کا اثر بھی پڑتا ہے۔ مگر خوش نصیبی سے ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ محسن بالکل ٹھیک اور نارمل پیدا ہوا تھا اور اس کی ہر ایکٹیویٹی نارمل بچے جیسی تھی' بلکہ وہ خاصا صحت مند تھا۔ ان کے زیادہ خیال رکھنے کی وجہ سے آج اس کا شمار آج کے ذہین بچوں میں ہوتا تھا۔

"ہم اسے چار سال سے پہلے اسکول میں داخل کروا دیں گے۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"ابھی ڈلوا دیں۔" وہ بھی گلاس وال سے باہر ہی دیکھ رہی تھی۔ جہاں نانا سے نواسا بال چھین کر بھاگ رہا تھا۔

"نہیں اب اتنی بھی جلدی نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

وہ ہنسا تھا اور اس کی ہنسی میں ثانیہ شامل تھی۔ نانا سے نواسا جیت گیا تھا۔

اور گلاس وال کے اس طرف کھڑے بچے کے ماں' باپ نے تالیاں بجائی تھیں۔ جواب ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر مدثر احمد اور ثانیہ مدثر جیتے تھے۔ یہ ان کا محسن تھا' ان کی امید تھا' اور اسی امید پر زندگی کا احساس خوب صورت تھا۔

☼